إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

ستمبر ۲۰۲۳ء

مُدیر: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

زیرِ سرپرستی: محمد منشا طور صاحب

اساتذہ: پروفیسر ڈاکٹر محمد امین، حافظ محمد عمران طحاوی (پی ایچ ڈی سکالر)

فتنوں سے بچنے کا ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ (ترمذی)

رُجوع اِلی القُرآن کورس

دورانیہ: تین ماہ (خواہش مند طلبہ اس کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکیں گے)

اہلیت: ایف اے (صرف مردوں کے لیے۔ عمر کی کوئی قید نہیں)

نصاب

ہوسٹل کی سہولت میسر نہیں ہے

۱۔ قرآن حکیم: تجوید، ترجمہ اور تحفیظ	۲۔ فہم قرآن
۳۔ سنت وسیرت النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	۴۔ تزکیۂ نفس
۵۔ قرآنی عربی	۶۔ بنیادی فقہی مسائل

۷۔ **لیکچرز** (اسلام اور جدید مسائل، مسلم عروج وزوال، اسلامی تحریکیں، مغربی فکر وتہذیب وغیرہ)

ایامِ تدریس: پیر تا جمعہ

اوقاتِ تدریس: صبح 9 تا 1 بجے دوپہر

انٹرویو: 18 ستمبر صبح 10 بجے

آغاز کلاسز: 19 ستمبر

برائے رجسٹریشن: 0300-4107282 0333-1913636 حافظ محمد عمران طحاوی

تحریکِ رُجوع اِلی القُرآن

بمقام 178- نیلم بلاک، گلی نمبر 2، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

قارئین البرہان کی خدمت میں

* ہمیں تعلیم وتزکیہ اور دعوت واصلاح کے دشت کی پیمائی میں تین دہائیوں سے زیادہ گزر گئیں۔ ہم اپنی تنہائی اور آبلہ پائی سے گھبرانے والے نہیں۔ البرہان کے اجراء کو بھی تیرہ برس بیت گئے تاہم ذہن میں آتا ہے کہ کوئی تو ہمارا ہم خیال ہوگا جو ہمارا ساتھ دینا چاہے۔ ان سطور سے مقصود یہ ہے کہ اگر بعض احباب رضا کارانہ طور پر اس شمع کو روشن رکھنے میں ہمارا ہاتھ بٹانا چاہیں، اپنے مال یا وقت یا صلاحیتوں میں سے کچھ تھوڑا سا ایثار ہمارے لیے کرنا چاہیں خصوصاً ریٹائرڈ اہل علم اسلامی علوم کی تحقیق وترجمہ میں اور نوجوان گھر بیٹھے میڈیا میں (پرنٹ، الیکٹرانک اور سوشل)، کمپوزنگ، ٹرانسکرائبنگ، پرنٹنگ اور ڈیجیٹل مارکیٹنگ وغیرہ میں، تو وہ ہم سے رابطہ فرمائیں۔

* ہم نے البرہان کے اگست ۲۰۲۳ء کے شمارے میں ملک بھر میں 'حلقہ ہائے تفہیم فکر مغرب' قائم کرنے کی تجویز دی تھی۔ اس حوالے سے ہم نے بعض دوستوں کو ذاتی خطوط بھی لکھے اور بعض سے تبادلۂ خیال بھی ہوا۔ اس سلسلے میں آپ سے درخواست ہے کہ 'تفہیم مغرب' کے موضوعات پر اگر آپ کا مطالعہ ہو اور آپ بطور مدرس کام کر سکتے ہوں تو مطلع فرمائیں۔ ہم لاہور میں چند دن کا ایک تربیتی پروگرام مدرسین کے لیے رکھنا چاہتے ہیں۔ کیا آپ اس میں شامل ہو سکتے ہیں؟ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہو سکتے ہیں جو مدرس بننا چاہتے ہوں۔

- آپ خود تو مدرس نہیں لیکن آپ اس قسم کا حلقہ اپنے ہاں قائم کر سکتے ہیں، کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں تاکہ ہم قریب ترین علاقے سے آپ کو مدرس کی فراہمی کا سوچیں۔

- علماء کرام سے خصوصاً درخواست ہے کہ اگر وہ اپنی جامعہ میں ایسا کورس کرانا چاہیں تو رابطہ کریں یا اگر وہ اپنے مسلک کے دوسرے مدارس میں یہ کورس کرا سکتے ہوں تو یہ نور علی نور ہوگا۔ کالجوں یونیورسٹیوں کے ذمہ داران خصوصاً شعبہ ہائے علوم اسلامیہ کے پروفیسر حضرات بھی توجہ فرمائیں۔ جزاکم اللہ خیرًا

محمد امین

برائے واٹس ایپ پیغامات: 0300-4354673 ای میل: ermpak@hotmail.com

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جلد ۲۷، شمارہ ۹، ستمبر ۲۰۲۳ء/ الصفر المظفر ۱۴۴۵ھ

مشمولات

O فکر و نظر

- تجدد گمراہی ہے اور متجددین گمراہ ہیں — مدیر — ۴

- چند فوری توجہ طلب دینی مسائل — ۶

O مقالۂ خصوصی

نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج کیا ہے؟ — پروفیسر ڈاکٹر محمد امین — ۹

O تعلیم و تربیت

- صحیح تعلیم و تربیت اور رجوع الی القرآن ہی واحد حل ہے — ڈاکٹر نجیب الحق — ۳۰

- تعلیمی انڈسٹری میں حیرت انگیز انقلاب — ڈاکٹر طفیل ہاشمی — ۳۴

- تین اہم تعلیمی موضوعات پر پریس بریفنگ — حافظ محمد عمران طحاوی — ۳۸

- قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری (۲) — سید خالد جامعی — ۴۰

- ہم اچھے مسلمان کیسے بنیں؟ — پروفیسر ارشد جاوید — ۸۳

O اسلام اور پاکستان

اصلاحِ عدلیہ کے لیے چند اہم تجاویز — سلیم طارق لون — ۴۴

O عالم اسلام /افغانستان

- افغان معیشت ترقی کی راہ پر گامزن — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۴۷

- افغان عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ (آخری قسط) — سید خالد جامعی — ۴۹

O فقہ و قانون

غیر عورت کے بیضہ سے پیدا شدہ اولاد کے مسائل (آخری قسط) — ڈاکٹر حسن مدنی — ۶۱

O تبصرۂ کتب

- امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل — لیاقت بلوچ — ۶۸

- ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کے تبصرے کا جواب 'اقامتِ دین کا صحیح منہج' — مدیر — ۷۱

O البرہان کی ڈاک — ادارہ — ۷۶

لیاقت بلوچ۔ حمید سیال۔ ملک شفقت حیات۔ رضی الدین سید

English Section ۸۲

Islamic Individuation and the Islamic Revolutionary Process: Book Review — Dr. Javed Akbar Ansari

مدیر

ڈاکٹر محمد امین

ادارۂ تحریر

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

حافظ محمد عمران طحاوی

لیگل ایڈوائزر

محمد یحییٰ رشید، ایڈوکیٹ ہائی کورٹ

انچارج سرکولیشن

(0300-4107282)

[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 85 روپے

سالانہ 1000 روپے۔ پانچ سال: 5000 روپے

تاحیات 40,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ

سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور

PK92SONE0000120000056341

برائے رابطہ

136 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

برائے آن لائن مطالعہ

www.alburhaan.pk

کمپوزنگ: حافظ محمد محسن یوسف

0306-4640366

فکر و نظر

تجدد گمراہی ہے اور متجد دین گمراہ ہیں

جاوید احمد غامدی متجدد اور گمراہ ہیں اور ان کے ہمنوا اور ہم خیال بھی

* یہ فتوے بازی، انتہاء پسندی اور مناظرانہ روش نہیں بلکہ بہت سنجیدہ علمی مسئلہ ہے۔ عرض یہ ہے کہ تجدد گمراہی ہے۔ تجدد یہ ہے کہ دین اسلام کی ایسی تشریح وتاویل کی جائے جو نصوص قرآن وسنت اور امت کے چودہ سو سالہ فہم قرآن وسنت کی بجائے کسی معاصر غیر اسلامی فکر وتہذیب سے متاثر ہو کر کی جائے۔ یا محدثات میں اجتہاد قرآن وسنت کی بجائے کسی غیر اسلامی فکر وتہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے مطابق کیا جائے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے کہ ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ ﴾[آل عمران ۳: ۸۵] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "من أحدث فى أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد"[۱] یعنی جو ہمارے دین میں کسی ایسی نئی چیز کا اضافہ کرے جو اس میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

* لہٰذا تجدد گمراہی ہے اور جو کارِ تجدد میں مشغول ہو وہ گمراہ ہے جیسے ہمارے ہاں غلام احمد پرویز تھے یا آج کل جاوید احمد غامدی ہیں۔ یہ بلاشبہ گمراہ ہیں اور جو ان کا ہم خیال ہو اور ان کے نظریات کا حامی ہو اس کے گمراہ ہونے میں بھی شک نہیں۔

لہٰذا جاوید احمد غامدی صاحب کے شاگرد اور ان کے حمایتی (جیسے ڈاکٹر عمار ناصر، خورشید ندیم اور ڈاکٹر خالد ظہیر وغیرہ) بھی گمراہ ہیں اور ان کی گمراہی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ لہٰذا جو لوگ ان کی گمراہ کن فکر کو 'نارمل دینی فکر' باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے جمہور علماء سے بنیادی اختلاف کو ''معمول کا اختلاف'' سمجھتے اور باور کراتے ہیں ان کا رویہ بھی غلط اور دینی لحاظ سے مضر ہے اور انہیں اس رویے سے باز آ جانا چاہیے۔

* ان گمراہ متجددین کے بارے میں دو رویے ہو سکتے ہیں۔ ایک رویہ ہے فتوے کا یا اظہار حق کا۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے دین کا نقصان نہ ہو اور وہ متجددین کی پیروی اور گمراہی سے بچ جائیں۔ وہ ان کے غلط نظریات سے متاثر نہ ہوں۔ یہ وہ رویہ ہے جو ہم نے

---

[۱] صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۲۶۹۷

اختیار کیا ہے اور ہم لوگوں کو خبردار کررہے ہیں کہ ان گمراہ لوگوں کی کے اتباع سے بچ کر رہو۔ یہ لوگ مغرب کے فکری غلام ہیں اور جو ان سے متاثر ہوگا اسے بھی مغرب کی الحادی فکر وتہذیب کا گرویدہ بنا کر چھوڑیں گے۔

تاہم جو لوگ ان کی اصلاح کی کوشش کررہے ہوں، جیسا کہ ہمارے محقق صوفیاء کا طریقہ ہے، تو وہ ان کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرسکتے ہیں کیونکہ سختی سے اصلاح نہیں ہوسکتی۔

متجددین خصوصاً جاوید احمد غامدی صاحب کی گمراہی کا عقیدہ کوئی ہمارا ذاتی عقیدہ نہیں ہے بلکہ ملک کی نامور دینی جامعات کے مفتی حضرات کے فتاویٰ اور جلیل القدر علماء کی آراء اس سلسلے میں موجود ہیں۔ ہم نے جب ملی مجلس شرعی میں، جو سارے دینی مکاتب فکر کی مشترکہ علمی مجلس ہے، یہ مسئلہ اٹھایا تھا تو سارے مکاتبِ فکر کے جید علماء نے متفقہ طور پر جاوید احمد غامدی کو گمراہ قرار دیا تھا بشمول مولانا زاہد الراشدی صاحب۔ لہٰذا جاوید احمد غامدی صاحب کا تجدد اور گمراہی پاکستان کے جمہور علماء کرام کا متفقہ فیصلہ ہے اور جو بھی اس کا حامی اور موید ہے (عمار ناصر صاحب وغیرہم) ظاہر ہے اس کا بھی وہی حکم ہوگا جو غامدی صاحب کا ہے۔

٭ ہم پھر کہتے ہیں کہ اسے تعصب، انتہا پسندی یا مولویانہ تشدد سمجھنا غلط ہے۔ یہ ایک سنجیدہ علمی مسئلہ ہے کیونکہ اس سے امت کی اور صحیح عقیدے کی بقاء وابستہ ہے۔ مغرب کی فکری اور عملی غلامی آج عالم اسلام کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے اور جو متجددین مغرب کی فکری و عملی غلامی کے علم بردار ہیں ان کا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہونا واضح ہے۔ یہ غلام احمد قادیانی کا اتباع ہے۔ اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اس شر اور مصیبت سے بچائے۔ آمین

خوارج کی شریعت؟

۸/اگست ۲۰۲۳ء کو فرمایا سپہ سالار پاکستان نے کہ وہ (TTP) کون سی خوارج کی شریعت پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے ہیں؟ ہم بھی ان سے متفق ہیں اور پاکستان میں خوارج کی شریعت کا نفاذ نہیں چاہتے؛ البتہ بڑے ادب سے ایک سوال ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ خود پاکستان میں کون سی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں؟

فکر و نظر

چند فوری توجہ طلب دینی مسائل

۱۔ جڑانوالہ کا واقعہ

دونوں فریق ذمہ دار ہیں

جڑانوالہ میں جو کچھ ہوا ہم اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اگر چہ معاملہ تحقیق طلب ہے کہ کیا اس واقعہ کے پیچھے سازش اور پلاننگ تھی اور اگر تھی تو کس کی؟ یا یہ ایک مقامی واقعہ تھا جو اچانک رونما ہوا۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جنہوں نے قرآن مجید کی توہین کی انہوں نے بُرا کیا اور جنہوں نے ردّ عمل میں چرچوں اور گھروں کو جلایا انہوں نے بھی بُرا کیا۔ ہم دونوں کی مذمت کرتے ہیں۔ اقلیتوں کو اکثریتی مسلم آبادی کی مقدس کتاب کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں۔ جب وہ ایسا کرتے ہیں تو شرارت کی ابتداء کرتے ہیں اور اشتعال کا سبب بنتے ہیں انہیں یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ جو مسلمان اس پر مشتعل ہو کر ان کے چرچ اور گھر جلا دیتے ہیں وہ بھی بہت بُرا کرتے ہیں۔ انہیں قانون ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے اور خود انتقامی کاروائیاں نہیں کرنی چاہئیں بلکہ یہ کام ریاستی اداروں پر چھوڑنا چاہیے۔

ہجوم کا انصاف

سوال یہ ہے کہ عوام کا ہجوم قانون کو ہاتھ میں کیوں لیتا ہے؟ اس وقت جب انہیں یقین ہو کہ ریاستی اداروں سے انصاف نہیں ملے گا۔ اسی لیے کراچی کے عوام نے چوروں کو پکڑ کر قتل کرنا شروع کر دیا تھا کیونکہ پولیس چوروں کے ساتھ مک مکا کر لیتی اور انہیں رشوت لے کر چھوڑ دیتی تھی۔ اگر عوام کو یقین ہو جائے کہ حکومت توہینِ قرآن، توہینِ رسالت اور توہینِ مذہب کے مرتکب لوگوں کو قرار واقعی سزا دے گی تو شائد وہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔

علماء کرام کا رویہ

علماء کرام کا رویہ اس واقعے میں بہت اچھا تھا کہ انہوں نے اشتعال انگیزی نہیں کی۔ کسی عالم دین نے عوام کو نہیں اکسایا اور نہ کسی مسجد سے عوام کو مشتعل کرنے کے اعلانات ہوئے۔ صرف ایک مسجد سے اعلان ہوا اور وہ بھی ایک داڑھی مونچوں صاف اَن پڑھ آدمی کا۔ لیکن ہم

کہتے ہیں کہ اتنا کافی نہیں۔ یہ بلاشبہ علماء کرام کی کامیابی ہے کہ انہوں نے قرآن حکیم سے مسلمانوں کی جذباتی وابستگی کو باقی رکھا ہے لیکن اس سے آگے کرنے کا اہم کام یہ ہے کہ وہ عوام کا قرآن سے شعوری اور عملی تعلق قائم کریں۔ علماء کرام ایسا نظام قائم کریں کہ عوام قرآن حکیم کو سمجھ سکیں اور اس پر عمل کر سکیں۔ جب تک یہ نہیں ہوتا عوام کی قرآن سے جذباتی وابستگی کے غلط رُخ اختیار کرنے کے امکانات غالب رہیں گے لہٰذا علماء کرام کو یہ کام ضرور کرنا چاہیے۔

انتظامیہ کی غیر ذمہ داری

اکثر ایسے معاملات میں انتظامیہ کی بے حسی، غفلت اور غیر ذمہ داری سامنے آتی ہے جو اس واقعہ میں بھی سامنے آئی۔ نہ پولیس بروقت حرکت میں آئی نہ مقامی مسیحی اسسٹنٹ کمشنر، جس سے معاملات بگڑ گئے۔ انتظامی افسران کو ایسے معالات کی حساسیت کو سمجھنا چاہیے اور بر وقت اقدام کر کے معاملے کو کنٹرول کر لینا چاہیے۔

اعلیٰ انتظامیہ کو بھی ایسے وقوع کے بعد پھرتیاں دکھانے کی بجائے پہلے ٹھوس حکمت عملی سے کام لینا چاہیے اور امریکہ و یورپ کے ڈر سے نہیں، اللہ سے ڈر کر اپنے معاملات کی سدھار کی فکر کرنی چاہیے۔

۲۔ ناموسِ صحابہ و اہل بیت ایکٹ

پارلیمنٹ نے آخری دنوں میں جو تیز رفتاری سے قانون سازی کی ان میں دیگر امور کے علاوہ یہ ایکٹ بھی شامل ہے جسے پارلیمنٹ میں موجود دینی جماعتوں کے قائدین نے حکومتی حمایت سے جلدی میں منظور کروالیا۔ اب اہل تشیع اس کے خلاف احتجاجی مہم چلا رہے ہیں۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ شروع ہی میں اہل تشیع کو مشاورت میں شریک کر لیا جاتا اور متفقہ رائے سے ایسا قانون پاس کیا جاتا جو سارے مکاتب فکر کے لیے قابل قبول ہوتا۔ اب اگر اہل تشیع نے اسے ردّ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس سے ملک میں فکری انتشار پیدا ہوگا اور بین المسالک منافرت میں اضافہ ہوگا جو ہر لحاظ سے ملک و ملت کے لیے نقصان دہ ہے۔ ہم ملی مجلس شرعی، ملی یکجہتی کونسل اور متحدہ علماء کونسل کے رہنماؤں سے درخواست کریں گے کہ وہ سنی شیعہ

منافرت کو روکنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

۳۔اقلیتی کمیشن بل

حال ہی میں تحلیل ہونے والی قومی اسمبلی نے افراتفری میں جو قوانین پاس کیے ان میں اقلیتوں کے حقوق کے لیے کمیشن کے قیام کا بل بھی شامل ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ بل سینٹ سے پاس نہیں ہوا اور قانون نہیں بن سکا۔ اس بل کا اضطراب انگیز پہلو یہ ہے کہ اس میں 2.5 فیصد اقلیت کو وہ حقوق دے دیے گئے ہیں جو 97.5 فیصد اکثریت کو بھی حاصل نہیں اور اس کمیشن کو وہ اتھارٹی دے دی گئی ہے جو مسلمانوں کی اسلامی نظریاتی کونسل کو بھی حاصل نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی قانون سازی بین الاقوامی غیر مسلم قوتوں کے دباؤ پر اور ان کے مقامی ایجنٹوں کی مدد سے ہوتی ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہ قومی اسمبلی میں موجود دینی جماعتوں کے ارکان کی غفلت اور بے عملی کا ہی نتیجہ ہے کہ اس طرح کا قانون بغیر کسی رکاوٹ کے پاس ہو گیا۔ اب دینی قوتوں کو بیدار رہنا چاہیے کہ یہ بل سینٹ سے پاس ہو کر قانون کی شکل اختیار نہ کر سکے۔

بقیہ: البرہان کے نام

تبلیغی جماعت اور ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی عشروں پر محیط اور ہر طبقے میں کسی حد تک مقبول قرآنی وصلواتی دعوت بھی کوئی نتیجہ خیز نہیں بن سکی۔ شور اور سرگرمی تو دونوں جماعتوں کی حد سے سوا ہے لیکن نتیجہ بے حیثیت ہی ہے۔

الجھن اصل میں یہ ہے کہ تبدیلی کا نتیجہ تو بہرحال ووٹ کے ڈبوں ہی سے برآمد ہوتا ہے لیکن تمام تبلیغ اور قرآنی دعوت بھی ووٹ کے ڈبے پر اثر انداز نہیں ہو پاتی۔ انقلابی اسلام کے داعی اور کارکنان دونوں ہی اب سخت الجھن میں ہیں۔ پھر یہ بھی کوئی عقل کی بات نہیں ہے کہ انسان دعوتی یا تبلیغی جدوجہد تو تمام جذبے سے کرے لیکن سیاست سے دور دور ہی رہے تو یہ تو دین کا بس ایک یک طرفہ کام ہی ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی میں ہمیں دونوں پہلو متوازن نظر آتے ہیں۔ دین تو ایک پیکیج ہے۔ نہ دعوت چھوڑ سکتے ہیں اور نہ سیاست چھوڑ سکتے ہیں۔

مقالۂ خصوصی

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

اگر سیاسی جدوجہد، اسلامی جمہوریت، پارلیمنٹ کی قانون سازی اور موجودہ عدلیہ کے ذریعے پاکستان میں شریعت نافذ نہیں ہوسکی تو پھر

نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج کیا ہے؟

سود کے خلاف جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں کی ناکام جدوجہد کے حوالے سے سلسلۂ گفتگو

دینی جماعتیں اور علماء کرام ہمارے مؤقف پر غور فرمائیں

ہمیں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ:

آپ نے البرہان کے اگست ۲۰۲۳ء کے شمارے میں جماعت اسلامی اور دیگر دینی جماعتوں کی کوششوں کے باوجود مسئلہ سود حل نہ ہونے کی بناء پر یہ تجزیہ پیش کیا کہ محض سیاسی جدوجہد سے جدید طرز کی قومی ریاست میں اسلامی جمہوریت کے ذریعے، پارلیمنٹ کی قانون سازی اور موجودہ عدلیہ کی مدد سے شریعت پاکستان میں بلکہ کسی بھی مسلم ملک میں نافذ نہیں ہوسکی اور نہیں ہوسکتی اور اس کا حل یہ بتایا ہے کہ تعلیم وتزکیہ اور اصلاحِ معاشرہ کو بنیاد بنایا جائے۔ آپ کی بات میں وزن ہوسکتا ہے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ ریاست میں نفاذِ شریعت کا کوئی متبادل منہاج ہے اور محض اصلاح فرد و معاشرہ سے ریاست اسلامی ہوجائے گی؟ اس کا آپ کیا جواب دیں گے؟

جواب

ہم اس اعتراض کا جواب تین پہلوؤں سے دیں گے۔ ایک یہ کہ ماضی میں مسلم معاشرے میں شریعت کیسے نافذ تھی؟ دوسرے یہ کہ پاکستان کے موجودہ مغرب زدہ سیاسی نظام کے ذریعے شریعت نافذ نہیں ہوسکتی۔ تیسرے یہ کہ متبادل منہاج کی تفصیلات کیا ہوسکتی ہیں؟ لیکن اس سے پہلے یہ ذہن میں مستحضر رہے کہ ہمارے نزدیک 'نفاذِ شریعت' سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ حکمران ریاست میں اسلامی قانون نافذ کردیں بلکہ نفاذِ شریعت سے مراد یہ ہے کہ فرد، معاشرہ اور حکومت اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کی زندگی کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت میں اس

کے احکام کے مطابق گزارے تاکہ اسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی حاصل ہو اور وہ جنت کی نعمتوں کا مستحق ٹھہرے۔ محض حکومتی سطح پر دنیا کی مادی وسیاسی کامیابی کبھی ایک مسلمان کا ہدف نہیں ہوتی۔ اور اب آیئے ہمارے تفصیلی جوابات کی طرف۔

۱۔ ماضی میں مسلم معاشرے میں شریعت کیسے نافذ تھی؟

مستفسر کے سوال کا جواب دینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم ان کو دعوت دیتے ہیں کہ اس بات پر غور کریں کہ استعمار کی مداخلت سے پہلے بارہ سو سال تک مسلم معاشروں میں شریعت کیسے نافذ رہی اور اس کے نتیجے میں مسلمان اور ان کی فکر وتہذیب دنیا کے اکثر حصے پر کیسے غالب رہی؟ جب آپ یہ جان لیں گے تو آپ کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ اسی طریقے پر عمل کرنے سے آج کے مسلم معاشروں اور ریاستوں میں بھی شریعت نافذ ہوسکتی ہے اور وہ مسلمانوں کو نہ صرف زوال سے نکلنے میں مدد دے سکتی ہے بلکہ ان کی نشأۃ ثانیہ کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

مسلم تاریخ کا تجزیہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ عہد نبوی کے بعد خلافت راشدہ میں حکومت علماء ومجتہدین کے ہاتھ میں تھی [کہ حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ سے بڑھ کر دین کا عالم اور اس پر عامل کون تھا؟ لہٰذا وہ دین ودنیا دونوں کے امام تھے] لیکن حضرت حسین بن علیؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی شہادت کے بعد مسلم اہلِ علم ودانش نے جب دیکھا کہ حکومت غیر عالموں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے اور وہ مسلم معاشرے اور حکومت کو اسلامی بنیادوں پر چلانے کے زیادہ اہل نہیں ہیں تو انہوں نے زندگی کے تین اہم شعبے تعلیم، تزکیہ اور فقہ وافتاء (یعنی احکام شریعت کی تفصیلات کا علم بذریعہ تشریح نصوص واجتہاد) حکومت کو دینے کی بجائے اپنے پاس رکھے۔ اسی طرح چوتھا اہم کام قضا کا انہوں نے حکمرانوں کو دیا لیکن اس پر بھی اپنی گرفت قائم رکھی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فرد، معاشرے اور حکومت کو اسلام پر عامل رکھنے کے لیے انہوں نے آج کل کی اصطلاح میں تعلیم (Education)، تزکیہ (Training/Moral Development)، قانون سازی واجتہاد (Legislation) اور عدلیہ (Judiciary) کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھنے کی حکمت عملی اپنائی جس کی کچھ تفصیل یہ ہے:

ا۔ تعلیم وتزکیہ

انہوں نے عامۃ المسلمین کی دینی ودنیاوی تعلیم کا انتظام مسجد ومدرسہ میں اپنے ہاتھ

میں پرائیویٹ سیکٹر میں رکھا۔عوام کی اسلامی ذہن سازی اورتعمیر شخصیت (Personality Developent) کا کام بھی خانقاہ کی صورت میں ان کے پاس رہا۔ یوں انہوں نے اسلامی تعلیمات پرعمل کا شدید داعیہ فرد میں پیدا کر دیا تا کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں برضاورغبت اسلامی احکام پر نہ صرف عمل کرے بلکہ اس کا داعی اور علمبر دار بن کر بھی کھڑا ہو جائے۔

۲۔فقہ وافتاء

ظاہر ہےقرآن وسنت کے احکام اجمالی ہیں تفصیلی نہیں ہیں جبکہ انسانی ضروریات متنوع اور کثیر ہیں۔اس کا حل شارع نے حفاظتِ متن قرآن اور نبوت محمدی کو عالمگیر قرار دینے کے علاوہ یوں پیش کیا کہ تغیر پذیر دنیاوی معاملات میں خود کو بنیادی پالیسی امور تک محدود رکھا اور تفصیلی سیاسی،معاشی،قانونی،تعلیمی نظام وضع کرنے کا کام امت کے علماء ومجتہدین کوسونپ دیا۔

صدرِاوّل میں فقہ وافتاء کا یہ کام امت کے دوررس مفادات کالحاظ رکھنے والے اہل علم ودانش نے حکومتوں کے سپرد کرنے کی بجائے پرائیویٹ سیکٹر میں علماء وفقہاء کے سپرد کیا اور یوں حکمران بھی اس کام میں علماء کرام کے محتاج ہو گئے جیسے پہلا اموی حکمران ابوالعباس السفّاح امام مالکؒ کے پاس گیا اور موطا کے حکومتی ذرائع سے نفاذ کی خواہش کا اظہار کیا لیکن امام مالکؒ نہیں مانے۔اسی طرح امام ابوحنیفہؒ نے اپنے زمانے کے مختلف شعبوں کے علماء کوجمع کر کے اجتماعی اجتہاد کی راہ اپنائی اور اسے مسلمانوں میں قبول عام حاصل ہو گیا۔

خلیفہ ہارون الرشید نے امام ابو یوسفؒ کو نظام قضا سنبھالنے کی درخواست کی تو انہوں نے امت کا مفاد دیکھ کر اسے قبول کر لیا جبکہ اس سے پیشتر ان کے استاد امام ابوحنیفہؒ حکمرانوں کی قاضی القضاۃ بننے کی درخواست ٹھکرا چکے تھے۔

۳۔نظام قضاء

علماءکرام نے قضا کا کام ضرورحکمرانوں کے سپرد کیا لیکن اس کا اہتمام اپنے ہاتھ میں رکھا مطلب یہ کہ قاضی ہمیشہ ایسا فرد ہوتا تھا جو دین کا عالم ہو اور اس پر عامل ہو(یعنی متقی اور صاحبِ کردار ہو)۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکمرانوں پر اگر مقدمہ ہوتا تو وہ بھی چل کر قاضی کے پاس آتے

اوراس کے فیصلے کے آگے سرِتسلیم خم کرتے ۔

مذکورہ بالا چار امور نے علماء کومعاشرے اورحکومت میں اخلاقی طور پر ہی نہیں عملاً بھی مقتدر بنادیا اوران کا مقام ومرتبہ معاشرے میں حکمرانوں اورقاضیوں سے بھی بڑھ کرتھا اوریہی چیزفرد، معاشرے اورریاست میں شریعت کی بالادستی کی ضامن بن گئی۔ہم اس کی صرف دو مثالیں پیش کرکےآگے بڑھ جائیں گے۔

امام ابوحنیفہؒ کے زمانے میں امام ابی داؤد کوفہ کے قاضی تھے۔وہ جوفیصلہ کرتے امام ابوحنیفہؒ اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے اوراس کے مقابلے میں اپنامختلف فتویٰ دیتے۔ امام ابوحنیفہؒ کافتویٰ چل جاتا اورامام ابی داؤد کا فیصلہ پیچھے رہ جاتا۔وہ اس پر بہت جزبز اورزچ ہوتے لیکن امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ اکثر اوقات ان کے قضا کے فیصلے کے خلاف آجاتا اوراس پر حاوی ہوجاتا۔

حکمرانوں اورعلماء کے تقابل کی ایک مثال محمد بن واسعؒ بن عبداللہ بن عمرؓ ابن خطاب کی ہے وہ بہت سادہ اور درویش منش آدمی تھے۔معمولی گھسے ہوئے کپڑے پہنے جوتا ہاتھ میں پکڑے طواف کررہے تھےلیکن جدھرجاتے لوگ احتراماً آگے سے چھٹ جاتے اورادباً راستہ دے دیتے۔اموی حاکم سلیمان بن عبدالملک اس وقت حرم میں موجود تھا اس نے سوچا کہ اصل حکومت تو ان لوگوں کی ہے۔وہ آگے بڑھا اورکہا کہ میرے لائق کوئی خدمت؟ انہوں نے کہا: امیرالمومنین! اللہ کے گھر میں مجھے شرم آتی ہے کہ اس کے سوا کسی سے مانگوں؟ سلیمان بھی کایاں آدمی تھا۔انتظار میں رہا اور جونہی وہ طواف سے فارغ ہوکرحرم سے باہر نکلے تو پھر ان کے پاس جاپہنچا کہ میرے لائق کوئی خدمت؟ اب تو آپ حرم میں نہیں ہیں؟ انہوں نے کہا امیرالمومنین! آپ دنیا کے کسی مسئلے میں میری مدد کریں گے یا آخرت کے؟ سلیمان نے کہا: آخرت پرمیرا کیا کنٹرول ہے، دنیا ہی کی کوئی بات کہیے۔وہ کہنے لگے: امیرالمومنین! دنیا تو مَیں نے اپنے ربّ سے بھی کبھی نہیں مانگی تو آپ سے کیا مانگوں؟ یہ کہا اورچل دیےاورسلیمان بیچارا اپنا سامنہ لےکررہ گیا۔

توخلاصہ یہ کہ معاشرے میں علماء کی قدرومنزلت حکمرانوں اورقاضیوں سے بڑھ کرتھی

اور انہیں اخلاقی طور پر اور عملاً حکمرانوں پر فوقیت حاصل تھی بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی حکومت درحقیقت ''علماء'' کی حکومت ہوتی ہے جیسی کہ عہد صحابہ میں تھی۔ ''علماء'' سے ہماری مراد کوئی خاص طبقہ نہیں (جیسے آج کل 'علماء' ہمارے ہاں عموماً ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو درسِ نظامی پاس ہوں اور کسی دینی مدرسے میں اسلامی علوم پڑھاتے ہوں یا کسی مسجد میں امام وخطیب ہوں)۔ 'علماء' کی حکومت کا مطلب تھیا کریسی (Thecracy یعنی مخصوص مذہبی طبقے کی حکومت) بھی نہیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے حقیقی مستحق وہ اشخاص ہوتے ہیں جنہوں نے دین اسلام کا گہرا مطالعہ کیا ہو اور وہ اس کی تعلیمات پر عامل ہوں یعنی اسلام کا علم رکھتے ہوں اور اس پر عمل کرتے ہوں جیسا کہ عہدِ صحابہ میں تھا اور جن لوگوں میں یہ خوبی نہ ہو وہ مسلم حاکم بننے کے اہل ہی نہیں۔ چنانچہ شروع دن سے امت کا آئیڈیل ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' رہا ہے، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت صرف وہ لوگ چلانے کے اہل ہوتے ہیں جو 'عالم' ہوں۔ دوسرے لفظوں میں اسلامی حکومت صرف وہ ہوتی ہے جسے 'علماء' چلائیں۔ جو لوگ نہ دین کا علم رکھتے ہوں اور نہ اس پر عمل کرتے ہوں، وہ 'جاہل' ہیں اور انہیں مسلمانوں پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امت کی تاریخ میں بارہ سو سال تک حکومت اسلامی تھی اور شریعت نافذ تھی کیونکہ حکومت بالواسطہ طور پر ''علماء'' کے ہاتھ میں تھی۔ بایں معنی کہ اس میں حکومت کے کرنے کے چاروں مذکورہ بالا کام علماء کے ہاتھ میں تھے یعنی عوام کی دینی تعلیم، تزکیہ وتربیت، فقہ وافتاء (قانون سازی) اور نظام قضاء یعنی عدلیہ۔ اسی لیے حکومتیں 'اسلامی' تھیں اور ان میں شریعت نافذ تھی۔ مسلمانوں کے بارہ سو سالہ دورِ حکومت کبھی کسی عالم یا دینی جماعت نے نفاذِ شریعت کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ کبھی انہیں نفاذ شریعت کی تحریک چلانے اور اس کے لیے جماعت بنانے کی ضرورت پیش آئی۔ کوئی حکمران اگر شریعت پر عمل کرنے میں تساہل برتتا تو اس پر علماء وصلحاء اکثر سرِعام نکیر کرتے تھے۔

پھر استعمار نے مسلم ممالک پر قبضہ کر لیا تو اس نے عمداً کوشش کر کے اور سازش کر کے علماء کو اس حیثیت سے محروم کر دیا اور پھر جب وہ انہیں 'آزادی' (؟) دینے پر مجبور ہوا تو اس نے حکومت اس طبقے کو دی جو اسلامی لحاظ سے 'جاہل' تھے بلکہ اس کے بعد بھی استعمار نے انہی کی

حکومتیں جاری رکھنے کی پلاننگ اور سازش کی چنانچہ پاکستان میں جتنے حکمران آج تک آئے ہیں وہ سب 'جاہل' تھے بایں معنی کہ نہ وہ دین کا علم رکھتے تھے اور نہ اس کی تعلیمات پر عامل تھے اور نہ انہوں نے علماء کرام کی مدد سے ملک میں نفاذ شریعت کی کوشش کی، خواہ وہ فوجی ہوں یا سویلین۔

ہماری بات بظاہر نئی ہے اور غیر مانوس لگے گی اس لیے ہم حکمرانوں، علماء کرام، دینی جماعتوں اور اہل فکر و دانش کے لیے دہراتے ہیں کہ بارہ سو سال تک مسلم فرد، معاشرے اور حکومت میں شریعت کے نافذ رہنے کا بڑا سبب 'علماء' کا اخلاقی اور عملی طور پر مقتدر ہونا تھا جس کے بڑے مظاہر یہ تھے:

۱۔ علماء وصلحاء کی طرف سے پرائیویٹ سیکٹر میں عوام کی دینی و دنیوی تعلیم اور تزکیہ وتربیت جس کی وجہ سے عوام وخواص اپنے اندر کی آواز اور ایمانی حرارت سے دینی احکام پر عمل کرتے تھے اور کرنا چاہتے تھے۔

۲۔ علماء کی معاشرے میں قدر و منزلت اور ان کی اخلاقی وعملی برتری (تعلیم وتزکیہ، فقہ وافتاء اور قضاء میں ان کی خدمات کی وجہ سے)۔

۳۔ نظام قضاء جو علماء کے ہاتھ میں تھا اور وہ سارے فیصلے شریعت کے مطابق کرتے تھے۔ حکمرانوں اور سول وفوجی بیوروکریسی کے خلاف مقدمات بھی وہی سنتے تھے اور بعض اوقات فیصلے ان کے خلاف بھی کر دیتے تھے۔ یوں گویا مسلم معاشرے میں شریعت اسلام کے نفاذ کا بڑا ادارہ قضاء کا تھا جو علماء کے ہاتھ میں تھا۔

خلاصہ یہ کہ بارہ سو سال تک اگر شریعت مسلم معاشروں میں نافذ رہی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کی دینی تعلیم وتربیت کا نظام علماء کے ہاتھ میں تھا اور عوام اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں شریعت پر عمل کرتے تھے اور کرنا چاہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ فقہ وافتاء یعنی معاشرتی اور ریاستی زندگی میں شریعت کی تفصیلات کا علم مہیا کرنا (قانون سازی) بھی علماء کے پاس تھا اور تیسرے یہ کہ عدلیہ یعنی نظام قضاء بھی علماء کے ہاتھ میں تھا۔ اور چوتھے یہ کہ حکمران اگر نفاذِ شریعت میں تساہل برتتے تو علماء ان کی اصلاح اور نکیر کرتے تھے۔

۲۔ پاکستان کے موجودہ مغرب زدہ سیاسی نظام کے ذریعے شریعت نافذ نہیں ہوسکتی

آج اگر پاکستان میں اور دوسری مغرب زدہ مسلم قومی ریاستوں میں شریعت نافذ نہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان چاروں شعبوں پر ریاست نے قبضہ کرلیا ہے اور ریاست کو جو حکمران چلا رہے ہیں وہ علماء نہیں بلکہ علماء کے مخالف ہیں تو ملک میں شریعت کیسے نافذ ہوسکتی ہے؟ اگر ہم آج ملک میں شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں تو یہ چاروں شعبے ''علماء'' کو دینا ہوں گے تاکہ جس طرح ماضی میں مسلم ممالک میں شریعت نافذ تھی آج بھی وہ مسلم ممالک میں نافذ و غالب ہوجائے۔ اس بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تعلیم، تزکیہ وتربیت، فقہ وافتا (یعنی قانون سازی) اور عدلیہ کے شعبوں کو جب تک آپ اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں چلائیں گے ملک میں شریعت نافذ نہیں سکتی۔ آج کی قومی ریاست (Nation State) یہ چاروں شعبے علماء کو دینے کو تیار نہیں کیونکہ اس کا سارا اسٹرکچر مغربی تہذیب پر کھڑا ہے جو اپنی اصل میں غیر اسلامی ہے۔ بدقسمتی سے مغربی فکر وتہذیب کا مطالعہ نہ ہمارے دینی مدارس میں رائج ہے اور نہ ہمارے کالجوں یونیورسٹیوں میں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مغربی فکر وتہذیب کے غیر اسلامی ہونے اور اسے ردّ کرنے کا تصور ہمارے ہاں مانوس نہیں۔ بہرحال مغربی فکر وتہذیب کا خلافِ اسلام ہونا ایک بنیادی مسئلہ ہے جسے ذہن میں رکھنا ضروری ہے اور جس کی طرف اشارہ کیے بغیر ہمارا آگے بڑھنا ممکن نہیں۔

مغربی تہذیب غیر اسلامی ہے

مغربی تہذیب کے اساسی افکار وعقائد (جیسے ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم، ایمپریسزم وغیرہ) عین کفر وشرک والحاد ہیں جن کی تشکیل میں حصہ لیا یونان کی بے خدا تہذیب، اور مغرب کی فکری تحریکوں نے (جیسے تحریک نشأۃ ثانیہ، تحریک اصلاحِ مذہب، تحریک تنویر، تحریک رومانویت، جدیدیت اور پس جدیدیت) اور ان کے حکماء ومفکرین اور دانشوروں نے (جیسے بیکن، ڈیکارٹ، لاک، ہوبز، کانٹ، ہیگل، نطشے، ڈارون، فرائیڈ، میکڈوگل، ہائیڈیگر، ہیبر ماس وغیرہ نے)۔ مغربی تہذیب ایک وضعی دین ہے، دینِ کفر وشرک ہے اور دینِ غیر اللہ ہے اور جو عین ضد ہے سماوی ادیان خصوصاً اسلام کی اور اس کے بنیادی عقائد کی اور وہ اللہ کے انکار اور اس کے

مقابلے میں انسان کی خودمختاری کا علمبردار ہے، آخرت کا منکر ہے اور رسالت کی نفی کرتا ہے۔

مغرب کا سیاسی نظام

غیر اسلامی ہے۔ جب مغربی تہذیب غیر اسلامی ہے اور اس کے بنیادی نظریات کفر وشرک پر مبنی ہیں تو ظاہر ہے ان نظریات کی پیداوار مغرب کی سیاسی فکر بھی غیر اسلامی ہے جیسے حاکمیتِ عوام کا نظریہ، وطن پرستی (نیشنلزم)، ریاست اور قومی ریاست (نیشن سٹیٹ) کا تصور اور جمہوریت، بلکہ جمہوریت میں آئین کے تقدس اور پارلیمنٹ کے سپریم ہونے کا نظریہ وغیرہ۔

جب مغربی تہذیب دین کی طرح مقدس ہے تو اس کا سیاسی نظام بھی مقدس ہے۔ نیشنلزم کے تقدس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ دنیا کی دو مہیب ترین جنگیں (یعنی پہلی اور دوسری جنگ عظیم) اہل یورپ کے درمیان اسی سبب لڑی گئیں۔ اہل مغرب نے 'جمہوریت' کو بھی ایک تقدس عطا کر دیا ہے اور وہ اس 'حق' کی علم برداری اور جن ملکوں میں ان کے خیال میں جمہوریت نہ ہو، وہاں اس کے نفاذ کے لیے مغرب علی الاعلان فنڈز مختص کرتا ہے اور ان ملکوں میں باقاعدہ مداخلت کرتا ہے۔ جمہوریت میں آئین مقدس ہوتا ہے جس کی خلاف ورزی کے لیے شدید سزائیں مقرر ہوتی ہیں (پاکستان میں بھی آئین توڑنے کی سزا موت ہے)۔ پارلیمنٹ کو بھی سب اداروں سے سپریم اسی لیے کہا جاتا ہے کہ وہاں عوام، جو دراصل حاکمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان کے نمائندے بیٹھتے ہیں اور وہ وہاں جو قانون چاہے بنا سکتے ہیں۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے سکتے ہیں اور مغرب کے کئی پارلیمان شراب نوشی، جوئے، زنا (برغبت فریقین) اور ہم جنس پرستی (مرد کا نکاح مرد سے اور عورت کا عورت سے) کو حلال اور جائز قرار دے چکے ہیں۔ پاکستان کی پارلیمنٹ بھی کئی غیر اسلامی قوانین پاس کر چکی ہے۔

مطلب یہ کہ مغربی تہذیب اور اس کی سیاسی فکر کے ذریعے یعنی حاکمیتِ عوام، ریاست، نیشنلزم، قومی ریاست اور جمہوریت، انتخابات اور پارلیمنٹ کی قانون سازی کے ذریعے اسلام نہیں آسکتا کفر وشرک ہی آسکتا ہے اور وہی مسلم معاشروں میں آرہا ہے اور غالب ہورہا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ جمہوری سیاسی نظام میں دینی سیاسی جماعتوں کی جدوجہد سے نہ شریعت نافذ ہوسکتی ہے اور نہ اسلام غالب آسکتا ہے۔ پاکستان کی موجودہ

دینی سیاسی جماعتیں جن میں مخصوص مسالک کی علمبردار وہ دینی سیاسی جماعتیں بھی شامل ہیں جنہوں نے جدید دینی تحریکوں (جماعت اسلامی، الاخوان المسلمون وغیرہ) کا تصورِ دین قبول کرلیا ہوا ہے اور وہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے مندرجہ ذیل چار نکاتی ایجنڈے پر کام کر رہی ہیں:

۱۔نفاذ شریعت بذریعہ سیاسی جدوجہد ۲۔بذریعہ اسلامی جمہوریت

۳۔بذریعہ پارلیمنٹ کی قانون سازی ۴۔بذریعہ موجودہ سیکولر عدلیہ

ان چار نکات پر مشتمل دینی سیاسی جماعتوں کا یہ ایجنڈا ہماری رائے میں، نہ شریعت کے معیار پر پورا اترتا ہے اور نہ عقل کی میزان پر۔اس کے لیے ہمارے دلائل وشواہد درج ذیل ہیں:

غلبۂ اسلام بذریعہ سیاسی جدوجہد

انبیاءکرام اور خصوصاً آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جو منہاج اللہ تعالیٰ نے اشاعت اسلام اور لوگوں کی دنیا کی بہتری اور آخرت کی کامیابی کے لیے دیا ہے اس کی بنیاد ہے "تعلیم وتزکیہ" یا دعوت واصلاح۔ اس کے نتیجے میں اکثر انبیاء ورسل کو معاشرے اور ریاست کی اصلاح اور غلبۂ اسلام کا موقعہ نہیں ملا (سوائے چند ایک کے جیسے حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یوسفؑ اور آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) لیکن ظاہر ہے وہ سب کامیاب ہوئے اور انہوں نے وہ ذمہ داری ادا کر دی جو اللہ تعالیٰ نے ان کے ذمہ کی تھی یعنی دعوت وتبلیغ واصلاح۔

ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم چونکہ اللہ کے آخری رسول تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں دین ودنیا دونوں کی کامیابی عطا فرمائی اور وہ مستقل نوعیت کی تھی چنانچہ آپ کا قائم کردہ معاشرہ اور مسلم حکومتیں پچھلے ساڑھے چودہ سو سال سے قائم چلی آرہی ہیں اور آج بھی قائم ہیں۔ان کی اصلاح اور انہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قائم کردہ مثالی معاشرے اور ریاست کی طرح بنانے کے لیے آج بھی وہی طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے جو انبیاء علیہم السلام اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کیا تھا یعنی تعلیمِ کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفوس کا راستہ جسے تبلیغ، دعوت، انذار اور اصلاح بھی کہا

جاتا ہے۔لہٰذا یہ راستہ منصوص ہے اور اسے ترک کر کے محض سیاسی جدوجہد اور سیاسی اقتدار سے افرادِ امت ، مسلم معاشرے اور ریاست کی اصلاح نہیں کی جاسکتی اور صرف سیاسی جدوجہد سے ''خلافت علی منہاج النبوۃ'' قائم کرنے کی کوشش نہ صرف غلط ہے بلکہ خلافِ نصوص بھی ہے اور عملاً بھی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔

نفاذِ شریعت بذریعہ اسلامی جمہوریت

ہم اوپر عرض کر چکے کہ مغربی جمہوریت کے بنیادی نظریات کفر وشرک ہیں اور خود یہ جمہوریت بھی کفر وشرک ہے کیونکہ اس میں عوام کی حاکمیت (Sovereignty) کا تصور خلافِ الوہیت وربوبیت ہے اور پارلیمنٹ کا بلا حدود وشروط حق قانون سازی بھی کفر وشرک ہے کیونکہ حلال وحرام کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔اس کفریہ جمہوریت کو'اسلامی' بنایا ہی نہیں جاسکتا بلکہ اگر کوئی کوشش کرے بھی تو اس سے کفر کا بچہ ہی نکل سکتا ہے کیونکہ محض کاغذی کاروائی کے ذریعے اگر مغربی جمہوریت کو'اسلامی' بنانے کی کوشش کی بھی جائے تو وہ نتیجہ خیر نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کا سارا سٹرکچر اور اس کی روح تو مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت والی ہی ہے۔'اسلامیت' کا لبادہ اڑھانے سے اس میں کوئی جوہری تغیر واقع نہیں ہوتا۔یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی'اسلامی جمہوریت' سے نہ پاکستان میں اسلام آیا ہے نہ کسی دوسرے مسلم ملک میں؛ بلکہ ہر جگہ مغربی تہذیب کی اقدار ہی غالب آئی ہیں۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ مغربی تہذیب ایک کُل ہے۔اگر اس کے کسی ایک جزو (مثلاً جمہوریت) کی اصلاح،فرض کیجیے،ہو بھی جائے تو وہ مثمر اور نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کُل کے باقی سارے اجزاء تو وہی کا فرانہ رہیں گے خصوصاً اس صورت میں کہ اس پر عمل کرنے والے (مسلم حکمران) مغربی تہذیب اور مغربی جمہوریت کے پرستار ہیں نہ کہ اسلام کے۔ اسلام تو محض'برائے وزنِ بیت'ان کے نام اور کام کا حصہ ہے ورنہ تو وہ مغرب کے فکری اور عملی غلام ہیں اور مغرب کی خواہش پر اس کی پالیسیوں پر عمل کرنے والے ہیں اور نہ قوتِ نافذہ (فوج،عدلیہ،بیوروکریسی،پولیس وغیرہ) اسلام پر عمل کرنا چاہتی ہے تو'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے اسلام کیسے نافذ ہوسکتا ہے؟

نفاذِ شریعت بذریعہ پارلیمنٹ میں قانون سازی

اسلام کی یہ متفقہ علمی روایت ہے کہ اجتہاد صرف ان علماء کرام کا حق ہے جو اس کے اہل ہوں یعنی جو علومِ قرآن وسنت پر عبور رکھتے ہوں اور عربی زبان اور فقہ واصول فقہ میں بھی مہارت رکھتے ہوں۔ یہ عامۃ الناس کا حق ہے ہی نہیں کہ وہ اجتہاد اور قانون سازی کریں لہٰذا شریعت کے نفاذ کو ان ارکانِ اسمبلی کا مرہونِ منت بنا دینا جو شریعت کی الف باء بھی نہیں جانتے خود غیر شرعی ہے اور شریعت سے کھلواڑ کے مترادف ہے۔ قانون کی تقنین (یعنی Codification) بھی ایک غیر اسلامی حرکت ہے کیونکہ اس سے حدود اور تعزیر میں خلط ملط ہوجاتا ہے، اس سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوجاتا ہے اور یہ تعزیر کو حدود کے ہم رتبہ بنانے والی حرکت ہے۔

پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ موجودہ حالات میں مقننہ (قومی اسمبلی، سینٹ اور صوبائی اسمبلیاں) اگر کوئی قانون اسلام کے مطابق بنا بھی دیں تو چونکہ ریاست کی ساری مشینری اس پر عمل نہیں کرنا چاہتی لہٰذا عملاً اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا کیونکہ اس اسلامی قانون پر عمل ہی نہ ہوگا۔ جیسا کہ حدود قوانین آئین میں موجود ہیں، زکوٰۃ اور عشر کا قانون موجود ہے، نفاذِ اردو کا قانون موجود ہے، قرآن حکیم اور عربی کی لازمی تدریس کا قانون موجود ہے۔ احترامِ رمضان المبارک کا قانون موجود ہے۔ قصاص ودیت کا قانون موجود ہے، قانونِ شہادت موجود ہے، توہینِ رسالت کے خلاف قانون موجود ہے لیکن ان میں سے کسی اسلامی قانون پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد نہیں ہورہا کیونکہ ریاست کے ادارے ان قوانین پر عمل کرنا ہی نہیں چاہتے۔

پھر بہت سے غیر اسلامی قوانین خود ہماری پارلیمنٹ نے پاس کیے ہیں جیسے سود کے حق میں قوانین، خواتین کے غیر اسلامی حقوق کی حفاظت کے قوانین، ٹرانس جینڈر کے نام پر ہم جنسیت کی قبولیت کا قانون وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان جیسی قومی جمہوری ریاست میں (جو عملاً مغرب کے نیشنلزم اور ڈیموکریسی کے تصورات پر مبنی ہے) اسلامی قانون سازی کے ذریعے یہ سمجھنا کہ اس میں شریعت عملاً نافذ ہوجائے گی ایک دیوانے کا خواب تو ہوسکتی ہے اور یہ حقائق سے آنکھیں

چرانے کا عمل تو ہوسکتا ہے لیکن اس سے شریعت عملاً نافذ نہیں ہوسکتی۔

نفاذِ شریعت بذریعہ موجودہ سیکولر عدلیہ

مغربی جمہوریت کی طرز پر پاکستانی سیاست اور'اسلامی جمہوریت' کی اساس ۱۹۷۳ء کے دستور پر ہے نہ کہ قرآن وسنت پر۔یعنی ہماری عدلیہ فیصلے آئین کے مطابق کرتی ہے اور خود کو ایسا کرنے کا پابند سمجھتی ہے نہ کہ قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے کو۔خصوصاً جب قرآن وسنت اور آئین میں تصادم یا عدم موافقت ہو تو عدلیہ آئین کے مطابق فیصلے کرتی ہے نہ کہ قرآن وسنت کے مطابق۔اس کی نمایاں مثال ممتاز قادری شہید کا کیس ہے۔دہشت گردی سے متعلق ابتدائی عدالت کے جج نے فیصلہ دیا کہ ملزم نے شرع کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی لیکن میں اسے پاکستان کے دہشت گردی کے خلاف بنائے گئے قانون کے تحت سزائے موت دیتا ہوں۔اور اس کی اپیل جب سپریم کورٹ پہنچی اور ممتاز قادری کے وکیل نے جب قرآن وسنت کے دلائل دینا شروع کیے تو اس وقت کے چیف جسٹس صاحب نے کہا کہ ہم نے تو فیصلہ آئین کے مطابق کرنا ہے۔شریعت کے دلائل دینے ہیں تو آپ کیس وفاقی شرعی عدالت لے جاتے۔چنانچہ انہوں نے آئین کے مطابق فیصلہ صادر کرتے ہوئے اپیل خارج کردی اور ممتاز قادری کی سزائے موت کی تائید وتوثیق کردی اور اسے پھانسی دے دی گئی۔

یہ بھی یاد رہے کہ قراردادِ مقاصد میں جو اسلامی اصول بنائے گئے تھے،خود مقننہ نے اسے آئین کے دیباچے کے طور پر باقی رکھا۔پھر جب جنرل ضیاء الحق نے آئینی ترمیم کرکے اسے آئین کی قابل عمل دفعات کا حصہ بنادیا تو بھی سپریم کورٹ نے قرار دیا کہ اسے باقی آئین کی دفعات پر حاوی قرار نہیں دیا جاسکتا۔یہ بات کہ پاکستان میں کوئی قانون خلافِ اسلام نہیں بنایا جاسکتا،یہ بھی آئین کے پالیسی کے اصولوں میں بیان کی گئی ہے نہ کہ اس کے قابل نفاذ حصے میں۔

پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ پاکستان کی عدلیہ کے سارے جج انگریزی قوانین اور انگریزی قوانین کے توسیع شدہ پاکستانی قوانین کے مطابق فیصلے کرتے ہیں۔قرآن وسنت کے مطابق فیصلے کرنے کی پابند صرف وفاقی شرعی عدالت ہے یا شریعت اپیلیٹ بنچ جو انتہائی غیر مؤثر ہے کیونکہ وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے ماتحت ہے۔سود کے خلاف فیصلہ اس

قانونی ثنویت (dichotomy) کی عمدہ مثال ہے کہ پچھلے تقریباً چالیس سال سے سود کے خلاف مقدمہ وفاقی شرعی عدالت اور سپریم کورٹ اپیلیٹ بنچ کے درمیان گیند (رولنگ بال) بنا ہوا ہے اور آج تک اس پر حتمی فیصلہ نہیں ہوسکا۔

پھر ستم یہ کہ ہمارے ججوں اور وکیلوں کی شرعی قانون میں تعلیم وتربیت کا کوئی میکانزم کسی نے آج تک بنایا ہی نہیں۔ ہر بڑے شہر میں لاء کالج موجود ہیں لیکن ملک بھر میں ایک بھی 'شریعہ اینڈ لاء کالج' موجود نہیں۔ (سوائے بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے اور وہاں کا نظام بھی غیر مؤثر ہے اور اس میں تقابلی مطالعہ کا اہتمام موجود ہی نہیں)۔ جب ہمارے وکیلوں اور ججوں کے لیے نیچے سے لے کر اوپر تک شرعی تعلیم وتربیت کا نظام موجود ہی نہیں، کسی کو قرآن وسنت اور عربی نہیں آتی اور کسی کو فقہ واصول فقہ پڑھایا ہی نہیں جاتا تو وہ شریعت کے مطابق فیصلے کیسے کر سکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں؟ جبکہ امت مسلمہ کی تاریخ میں بارہ سو سال تک قاضی قرآن وسنت کے مطابق براہ راست فیصلے کرتے تھے اور تعزیر میں اجتہادی نقطۂ نظر اختیار کرتے تھے۔ وہ کسی قومی یا صوبائی اسمبلی کے پاس کردہ قوانین کے پابند تھے نہ کوئی مدون قانون (Codified Law) ان کا ہاتھ پکڑتا تھا تو شریعت نافذ ہوجاتی تھی۔ حاصل یہ کہ پاکستان کی موجودہ سیکولر عدلیہ اور عدالتی نظام کے ہوتے ہوئے اسلامی شریعت پر عمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ شریعت کے نفاذ کا خواب دیکھا جا سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ پاکستان کے موجودہ مغرب زدہ جمہوری سیاسی نظام میں، جسے محض اسلام کے نام کی دھونی دی گئی ہے، سیاسی جدوجہد، اسلامی جمہوریت، پارلیمنٹ کی قانون سازی اور سیکولر عدلیہ کے ذریعے شریعت نافذ نہیں ہوسکتی۔

۳۔ متبادل منہاج کیا ہے؟

سوال یہ ہے کہ مندرجہ بالا تجزیے کے بعد آج کے ماحول میں پاکستان میں نفاذ شریعت کی متبادل حکمت عملی کیا ہوسکتی ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے ہم چاہیں گے کہ قارئین مندرجہ ذیل امور ذہن میں رکھیں:

۱۔ ہم نے یہ نہیں کہا کہ متبادل سیاسی حکمت عملی کیا ہوگی بلکہ یہ کہا ہے کہ متبادل حکمت عملی

کیا ہوگی؟ کیونکہ محض سیاسی جدوجہد سے شریعت نہ پہلے نافذ ہوئی تھی، نہ آج نافذ ہوسکتی ہے۔

۲۔ ماضی میں جس طرح مسلم معاشرے میں شریعت نافذ رہی اسی پروسیس کو آج دہرانے کی ضرورت ہے۔

۳۔ مغربی فکر وتہذیب کے موجودہ غلبے اور مسلم حکمرانوں پر مغربی حکمرانوں کے دباؤ کے تناظر میں آج کے پاکستان میں نفاذ شریعت کی حکمت عملی وضع کی جائے۔

اب آیئے ان چھ شعبوں میں (۱) متبادل حکمت عملی کی جانب، جن کی مدد سے ماضی میں بارہ سو سال تک مسلم معاشرے میں 'علماء' کی کوششوں سے شریعت نافذ رہی۔

۱۔ تعلیم کتاب وحکمت

قرآن حکیم میں چار دفعہ (۲) اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے لیے اس مقصد سے 'تعلیمِ کتاب وحکمت' کے الفاظ استعمال فرمائے ہیں۔ تعلیمِ کتاب سے مراد تعلیمِ قرآن حکیم ہے اور اس کی حیثیت نظامِ تعلیم میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے اور اسے ہی نظامِ تعلیم کا سب سے بڑا جزو ہونا چاہیے کہ اسے پڑھا جائے، اسے سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ نبی کریم ﷺ کی سنت وسیرت کی تعلیم کو اسی سے ملحق سمجھنا چاہیے۔

تعلیمِ حکمت سے مراد وہ سارے علومِ عقلیہ ہیں جن کی یا تو قرآن وسنت کی نصوص کی روشنی میں تفصیل کی جاتی ہے جیسے معاشیات، سیاسیات، تدریب المعلمین، علم النفس وغیرہ یا وہ علوم سائنس وٹیکنالوجی کی نوعیت کے ہیں جن میں اسلامی مقاصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

ماضی کے بارہ سو سالوں میں ان علوم کی تعلیم وتدریس ایک ہی نظامِ تعلیم کے تحت پرائیویٹ سیکٹر میں علماء کرام کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ آج کل مغربی استعمار کی غلامی نے

---

(۱) ہم نے ماضی میں صرف چار اہم شعبوں کا ذکر کیا ہے۔ معاشرتی تنظیم کا اس لیے ذکر نہیں کیا کہ وہ پہلے چار شعبوں کی وجہ سے خود بخود حاصل تھی اور نفاذ شریعت کے لیے امت کو منظم سیاسی جدوجہد کی ماضی میں ضرورت ہی نہیں پڑی۔

(۲) البقرہ ۲: ۱۲۹، ۱۵۱، آل عمران ۳: ۱۶۴، الجمعہ ۶۲: ۲

اسے 'دینی مدارس کا نظام تعلیم' اور 'جدید عصری علوم کی تدریس' کے دو متوازی دھڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ یہ ثنویت غیر اسلامی اور غیر ضروری ہے۔ آج کے مسلم 'علماء' کو دینی مدارس میں دنیاوی علوم کی تدریس کو (مغرب کے الحاد کا زہر ان میں سے نکالنے کے بعد) جز و نصاب بنانا چاہیے اور دنیاوی تعلیم کے ادارے بھی اسلامی تعلیم وتربیت کے غلبے کے ساتھ قائم کرنے اور چلانے چاہئیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ 'علماء' وہ افراد تیار کرنے لگیں گے جو اسلامی ذہن کے ساتھ سیاست، عدلیہ، فوج، بیوروکریسی، پولیس وغیرہ کے شعبوں میں کام کریں گے اور ان شعبوں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق چلائیں گے۔

اس وقت دینی مدارس کو پرائیویٹ سیکٹر میں کام کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح دنیاوی علوم (یا جدید عصری علوم) کی تدریس کی بھی پرائیویٹ سیکٹر میں اجازت ہے لہٰذا 'علماء' کرام کے ہاتھ کھلے ہیں اور وہ جس طرح ماضی میں تعلیمی شعبے میں کام کرتے تھے، آج بھی کر سکتے ہیں اور انہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ متحد ہو جائیں تو وہ اس راہ میں حائل مشکلات کا حل بہتر انداز میں کر سکیں گے۔

سوال یہ ہے کہ 'علماء' کرام یہ کام کیوں نہیں کرتے؟ اور کیوں نہیں کر سکتے؟ مادی وسائل کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہونے چاہئیں کہ قوم آج بھی اربوں روپے سالانہ روایتی علماء کرام کو ادارے چلانے کے لیے دیتی ہے اور کام میں تنوع اور اضافے سے ان کی مزید خدمت بھی یقیناً کرے گی۔ اصل مسئلہ تو وژن (Vision) اور اس پر عمل کا ہے۔

۲۔ تزکیہ وتربیت

قرآن حکیم کے اسلوب سے پتا چلتا ہے کہ تعلیم کتاب وحکمت کا حاصل تزکیۂ نفس ہونا چاہیے (کہ قرآن حکیم میں بعض جگہ تزکیہ کا ذکر تعلیمِ کتاب وحکمت کے بعد آیا ہے اور بعض جگہ اس سے پہلے۔ گویا تعلیم کتاب وحکمت کا حاصل بہر حال تزکیۂ نفس ہی ہے)۔ تزکیۂ نفس سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے نفس کی ایسی تربیت کہ کتاب اللہ کے احکام پر عمل انسانی طبیعت کا خاصہ اور اس کا تقاضا بن جائے اور وہ بخوشی و برغبت الٰہی تعلیمات پر عمل کرنے لگے۔

ماضی میں علماء وصلحاء نے اس مقصد سے زاویے/ رباط/ خانقاہیں قائم کر لی تھیں اور

'تصوف' کے نام سے ایک ادارہ خاص اس مقصد سے قائم کرلیا تھا۔اصل یہ ہے کہ تزکیہ لازمی نتیجہ ہے صحیح تعلیم کا اور یہی وجہ ہے کہ پہلے اکثر خانقاہوں میں مدرسہ بھی ہوتا تھا (اور بعض جگہ آج بھی ہوتا ہے)اور نہ بھی ہوتو مربی بہرحال تزکیہ کے لیے 'تعلیم' کو بھی ضروری سمجھتے تھے اور اس کا اہتمام بھی کرتے تھے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آج بھی تعلیمی ادارے (خواہ دینی مدارس ہوں یا جدید دنیوی تعلیم کے مراکز) تعلیم کے ساتھ تربیت وتزکیہ کا کام کریں اور جن لوگوں کی اس طرح تربیت میں کمی رہ جائے ان کے لیے خصوصی تربیتی مراکز قائم کیے جائیں (تسمیات سے قطع نظر کہ انہیں خانقاہ کہا جائے یا تربیتی مرکز۔اس کی زیادہ اہمیت نہیں۔اصل غرض تو کام سے ہے کہ وہ ہونا چاہیے اور بہر قیمت ہونا چاہیے)۔

تربیت اور تزکیۂ نفس جسے آج کل تعمیر شخصیت (Personality Development) اور تعمیرِ سیرت وکردار (Character Building) بھی کہتے ہیں، اس کی جگہ صرف تعلیمی ادارے یا تربیتی مراکز (خانقاہیں) نہیں بلکہ پروفیشنل ٹریننگ کے مراکز سے بھی یہی کام لیا جانا چاہیے جیسے سیاستدانوں کی پارلیمنٹ، ججوں کی تربیت کے ادارے، بیوروکریسی کے افسروں کی تربیت کے ادارے، ڈاکٹرز، انجینئرز، وکلاء کی تعلیم وتربیت کے ادارے غرض تعلیم وتربیت جہاں بھی ہو، جس شعبے میں بھی ہو اسے اسلامی تناظر میں تزکیۂ نفس کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ ایسے نفوس تیار ہوسکیں جو اپنے اپنے شعبے میں ٹھیک اسلامی تعلیمات کے مطابق خدمات انجام دے سکیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کام اگر علماء وصلحاء ماضی میں پرائیویٹ سیکٹر میں کرتے تھے تو آج کیوں یہ پرائیویٹ سیکٹر میں نہیں ہوسکتا؟ اور 'علماء' کیوں یہ کام نہیں کرسکتے؟

روایتی تصوف کے حلقے آج بھی معاشرے میں کام کررہے ہیں لیکن مسلم زوال کے بعد جس طرح دوسرے شعبوں میں زوال آیا، یہ شعبہ بھی انحطاط کا شکار ہوا اور اس میں بہت سے غیر اسلامی رسوم ورواج نے راہ پالی جن سے اہلِ علم وصلاح خوب واقف ہیں لہٰذا ہمیں اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں لیکن اس روایتی تصوف کی بھی اصلاح کی ضرورت ہے اور

یہ اصلاح بھی عصر حاضر کے علماء وصلحاء کو کرنی چاہیے۔

۳۔فقہ وافتاء

ماضی میں جس چیز کو فقہ وافتاء کہتے تھے آج اس کی صورتِ حال کیا ہے؟ آج 'قانون سازی' قومی ریاست کے پاس چلی گئی ہے جس میں 'قانون' مغرب کا چلتا ہے اور اس قانون سازی کے لیے شریعت میں مہارت کی کوئی ضرورت نہیں۔ دینی مدارس میں فقہاء نکاح وطلاق کے مسائل کی تفصیلات لوگوں کو بتادیتے ہیں اور آج کی زندگی کے مختلف شعبوں (معاشیات، سیاسیات، نفسیات، صنعت، زراعت، ٹیکنالوجی، میڈیا، بیالوجی (ڈی این اے، کلوننگ) انفارمیشن ٹیکنالوجی، مصنوعی ذہانت (AI) وغیرہ کے شعبوں کی ان کو کوئی خبر نہیں۔

حالت یہ ہے کہ آج ہر دینی مدرسہ میں فقہ اور اصولِ فقہ پڑھائی جاتی ہے لیکن پچھلی صدیوں کی۔ آج کے مسائل کیا ہیں اور ان کا حل کیا ہے؟ یہ عموماً زیر بحث نہیں آتا۔ نہ طلبہ میں قرآن وسنت سے استنباط کا ملکہ پیدا کیا جاتا ہے اور نہ جدید امور میں اجتہاد کی پریکٹس انہیں کرائی جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے اپنے مسلک کی فقہ کے سپاہی اور مناظر تو بن جاتے ہیں، اجتہاد کا ملکہ ان میں پیدا نہیں ہوتا۔ مغرب کے دساتیر وقوانین اور اصول قوانین سے وہ ناواقف ہوتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے بین الاقوامی قوانین کی بھی انہیں خبر نہیں ہوتی۔ انہیں سرے سے انگریزی ہی نہیں پڑھائی جاتی کہ وہ جدید قانون اور اصول قانون کا مطالعہ کرسکیں، عصری مسائل سے آگاہ ہوسکیں اور ان کے حل کے بارے میں سوچ سکیں۔

دوسری طرف حالت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر شہر میں مغربی اور پاکستانی قوانین پڑھانے کے لیے لاء کالج موجود ہیں لیکن کسی جگہ شریعہ کالج یا لاء اینڈ شریعہ کالج موجود نہیں۔ کسی دینی جماعت یا علماء کی جماعت کو کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ ان حالات میں ایسے فقہاء ومفتی اور قاضی (یا وکلاء اور ججز) کہاں سے آئیں گے جو شریعت کے ماہر ہوں اور جدید قانونی حالات سے بھی بخوبی واقف ہوں۔

سوال یہ ہے کہ علماء کرام دینی مدارس کے فقہ واصول فقہ کے موجودہ نصاب ونظام کو

کیوں نہیں بدلتے ؟ اس میں رکاوٹ کیا ہے؟ وہ شریعہ اینڈ لاء کالج کیوں نہیں قائم کرتے ؟ کس نے ان کا ہاتھ پکڑا ہوا ہے؟ ضرورت صرف وژن کے بدلنے کی ہے۔

۴۔ نظامِ قضاء (عدلیہ)

پاکستان میں موجودہ سیکولر عدلیہ کی کیا کیفیت ہے، اس کا ذکر پہلے گزر چکا۔ سوال یہ ہے کہ جب ملک میں وکلاء اور ججوں کی شریعہ میں تعلیم وتربیت کا نظام موجود ہی نہیں تو فیصلے شریعت کے مطابق کیسے ہوسکتے ہیں؟ موجودہ حالات میں بہتری کیسے آسکتی ہے؟ اور جب ہماری دینی جماعتیں اور علماء کرام اس کام کی ضرورت واہمیت کو ہی نہیں سمجھتے تو نظام میں بہتری لائے گا کون؟

اس میں شک نہیں کہ اس وقت نظامِ عدل ریاست کے کنٹرول میں ہے اور علماء کا کردار اس میں محدود ہے لیکن علماء کرام اگر مندرجہ ذیل تین کام کرلیں تو حالات میں بڑی تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔

۱۔ علماء کرام اور دینی جماعتیں ملک کے بڑے شہروں میں لاء اینڈ شریعہ کالج قائم کریں۔

۲۔ موجودہ وکلاء اور ججوں کی شریعہ میں ٹریننگ کا انتظام کریں۔

۳۔ ہر مسجد میں ایک مصالحتی کمیٹی قائم کریں جو امام صاحب (عالم دین) اور علاقے میں موجود کسی ریٹائرڈ نیک نام جج اور وکیل کی مدد سے کام کرے۔ مسجد ہی میں اس کمیٹی کے اجلاس ہوں۔ اس سے عدالتوں پر بوجھ میں کمی ہوگی۔ لوگوں کو انصاف بلا قیمت اور گھر کے قریب ملے گا اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ملے گا۔ مسجد اور مولانا صاحب کے کردار اور وقعت میں اضافہ ہوگا۔ پاکستان کا آئین اور قوانین بھی اس طرح کی ثالثی کونسلوں کی حمایت کرتے ہیں۔

معاشرے میں اگر انگریزی اور جدید قوانین سے واقف علماء وفقہاء موجود ہوں تو وہ اعلیٰ عدالتوں کے فیصلوں پر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقید کرکے اہم خدمت انجام دے سکتے ہیں اور موجودہ سیکولر قانونی نظام پر بھی اثر انداز ہوسکتے ہیں۔ آج ایسے افراد کی بھی کمی ہے۔ علماء کرام اور دینی جماعتوں کو اس کمی کو دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے اور اس کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ نظامِ عدل کو، موجودہ جکڑ بندیوں کے باوجود، نفاذِ اسلام کے لیے استعمال کیا جاسکے۔

۵۔معاشرتی تنظیم سے کام لینا

ماضی میں اس عنوان سے کام کی ضرورت نہ تھی کیونکہ یہ چیز میسر تھی۔آج مسلم معاشرے کے زوال کے سبب، استعمار کے اثرات کی وجہ سے اور مسلم معاشروں میں مغرب کے ایجنٹ حکمرانوں کی پالیسیوں کی وجہ سے ضرورت ہے کہ موجودہ ریاست کے اندر رہتے ہوئے خاموشی سے معاشرتی اداروں کو منظم کر کے اسلامی تعلیمات پر عمل کر کے اسلامی مقاصد حاصل کیے جائیں۔اس کی ایک مثال مسجد و مدرسہ کا حکومت کے بغیر مسلم عوام کی مدد سے چلایا جانا ہے۔جب یہ کام حکومتی مدد کے بغیر ہوسکتا ہے تو مزید کام کیوں نہیں ہوسکتے؟ ضرورت صرف وژن بدلنے کی ہے۔

ہم کہتے ہیں دوسری ساری باتیں چھوڑیے صرف مسجد کا ہی وہ نظام بحال کر دیا جائے جو عہد نبوی میں تھا تو خاموشی سے بڑی سماجی تبدیلی (Social Change) لائی جاسکتی ہے۔ امام مسجد صاحب کے زیر نگرانی و سرپرستی مندرجہ ذیل کمیٹیاں بنائی جاسکتی ہیں:

۱۔ **مالیاتی کمیٹی:** محلے میں غریبوں، بیواؤں، مسکینوں کی مالی مدد کے لیے۔تاجروں کی باہم بلاسود مالی سرگرمیاں، حلال تجارت کے فروغ کے لیے۔

۲۔ **مصالحتی کمیٹی:** علاقے کے لوگوں کے جھگڑے نمٹانے کے لیے

۳۔ **خدمت خلق کمیٹی:** محلے کے بجلی، پانی، روشنی کے مسائل سے نمٹنے کے لیے

۴۔ **امن و امان کمیٹی:** سٹریٹ کرائمز روکنے کے لیے، پہرے کے انتظام کے لیے

۵۔ **تعلیمی کمیٹی:** علاقے کے تعلیمی مسائل، تعلیمی اداروں میں داخلہ، غریب طلبہ کی مدد، فری ٹیویشن سنٹر وغیرہ کا قیام

۶۔ **ثقافتی کمیٹی:** کھیلوں کا انتظام، مذہبی تہواروں عیدین، استقبالِ رمضان، محلے میں ترجمۂ قرآن و درسِ قرآن وغیرہ۔

اس کام کو معمولی نہ سمجھا جائے اگر دینی جماعتیں اور علماء کرام مل کر اس کام کو منظم انداز میں فروغ دیں اور بتدریج اس کا نیٹ ورک سارے ملک تک پھیلا دیں اور یہ کام خاموشی سے

کریں، اس کا پروپیگنڈا نہ کریں تو ہم کہتے ہیں کہ اس طرح اسلامی انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور معاشرے میں اسلام پر عمل کی جڑیں گہری پھیل سکتی ہیں۔

۶۔سیاسی جدوجہد

ہم نفاذِ شریعت اور غلبۂ دین کے لیے سیاسی جدوجہد کے منکر نہیں، اس کی ضرورت واہمیت کے قائل ہیں۔ خاص طور پر یہ دیکھتے ہوئے کہ مغربی فکروتہذیب کے علم بردار ممالک اسلام و مسلم دشمن ہیں اور وہ کبھی حقیقی اسلامی ریاست قائم نہیں ہونے دیں گے لہٰذا ان کے اس زور کو قوت سے توڑنا ناگزیر ہے جس کے لیے اسلامی ریاست قائم کیے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کا بھی ادراک ہے کہ ایک مغرب زدہ قومی ریاست میں مغربی جمہوریت یا 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے علماء اور دینی جماعتیں اقتدار میں نہیں آسکتیں تو پھر حکومتی اقتدار علماء اور دینی لوگوں کے ہاتھ میں کیسے آئے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ کام صرف سیاسی جدوجہد کے ذریعے نہیں ہوسکتا۔ تاہم اگر سیاسی جدوجہد سے پہلے مذکورہ بالا پانچ کام شروع کردیے جائیں تو البتہ کامیابی مل سکتی ہے لیکن ان کاموں کا نتیجہ سال دو سال میں نہیں نکل سکتا۔ اگر یہی کام ۷۵ سال پہلے شروع کردیے گئے ہوتے تو ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ پاکستان آج ایک طاقتور صحیح اسلامی مملکت ہوتا۔ اب بھی یہ پانچ کام شروع کردیے جائیں اور دینی جماعتیں اور علماء کرام مل کر، شرط یہ ہے کہ مل کر، یہ کام شروع کردیں تو اسلامی انقلاب کا آغاز ہوجائے گا۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں سیاسی جدوجہد کی صورت کیا ہو؟ ہم کہتے ہیں سیاسی جدوجہد کا صرف ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا جو ہمیں مغربی جمہوریت سکھاتی ہے۔ سیاسی تبدیلی لانے کا ایک منہج وہ بھی تھا جو ہمارے اسلاف ماضی میں اپناتے رہے خصوصاً اس کی بہترین مثال حضرت مجدد الف ثانیؒ کی ہے کہ انہوں نے تعلیم وتزکیہ کے ساتھ وزراء واعیانِ حکومت کی اصلاح کی کوشش کی جس کے نتیجے میں اکبر وجہانگیر جیسے سیکولر حکمرانوں کی بجائے اورنگ زیب عالمگیر جیسا حکمران مسلمانوں کو نصیب ہوا۔

مطلب یہ کہ جمہوری طرز کے انتخابات اور موجودہ غیر صالح مسلم حکمرانوں سے حریفانہ

مسابقت ہی واحد سیاسی حل نہیں اگر ساری دینی قوتیں مل کر ایک بڑا غیر انتخابی سیاسی پریشر گروپ بنالیں تو بہت سے اسلامی مطالبے منوائے جاسکتے ہیں اور بہت سی غیر اسلامی خرابیوں پر قابو پایا جاسکتا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ساری دینی جماعتیں مل کر اس چھ نکاتی پیکیج پر کام شروع کردیں تو صرف دس سال کے عرصے میں یہ دینی سیاسی پریشر گروپ سافٹ انقلاب کے ذریعے برسراقتدار آجائے گا، ان شاء اللہ۔ اس سافٹ انقلاب کی حکمت عملی کی تفصیلات بوقتِ ضرورت طے کی جاسکتی ہیں۔

حاصلِ بحث

موجودہ ''اسلامی جمہوریت'' کے تحت سیاسی جدوجہد کرکے موجودہ نظام حکومت یعنی پارلیمنٹ، عدلیہ، فوج اور بیوروکریسی کے ذریعے پاکستان میں شریعت کبھی نافذ نہیں ہوسکتی۔ پاکستان میں نفاذِ شریعت کا صحیح طریقہ وہی ہے جس طریقے سے مسلم معاشرے میں بارہ سو سال تک شریعت غالب رہی۔ آج اس چھ نکاتی منہج پر عمل کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اس کی وضاحت ہم نے سطور بالا میں کردی ہے۔

ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر پاکستان کی دینی قوتیں آج ان چھ نکات پر عمل شروع کردیں تو اگلے دس سال میں پاکستان ایک طاقتور اسلامی ریاست کے طور پر ابھر سکتا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

ہم آخر میں اس بات کو دہرادیں جس کا ہم نے ابتداء میں ذکر کیا تھا کہ ایک مسلمان کے پیشِ نظر بنیادی ہدف صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں اللہ ورسول کی تعلیمات پر عمل کماحقہ، اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، کرسکے تاکہ وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرسکے اور اس کی نعمتوں کا مستحق بن سکے محض دنیا میں مادی اور سیاسی کامیابی یا سیاسی جدوجہد کبھی مسلمان کا ہدف نہیں ہوتی۔

ہم اپنی آراء پر اہلِ فکر ونظر کے سنجیدہ تبصرے کے منتظر رہیں گے۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر نجیب الحق[۱]

مدیر البرہان کے مضمون 'مغرب کی الحادی تہذیب کا سیلابِ بلاخیز ۔ بچاؤ کی کوئی صورت' پر تبصرہ

صحیح تعلیم و تربیت اور رجوع الی القرآن ہی واحد حل ہے

برادرِ محترم محمد امین صاحب

آپ نے زیرِ نظر مضمون میں ایک بنیادی مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ہم جس طرح اس شیطانی تہذیب کا حصہ بن رہے ہیں بلکہ کافی حد تک بن چکے ہیں وہ سب دردِ دل رکھنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ لوگوں کی اکثریت اس سے کسی نہ کسی سطح پر متاثر تو ہے ہی لیکن افسوس کہ اب تو اس کی خباثتوں کا احساس بھی مٹتا جا رہا ہے ۔

وائے ناکامی! متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مغربی الحادی تہذیب کے سیلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ کی تجاویز سے عمومی اتفاق کرتے ہوئے ترجیحات کے لحاظ سے دو بنیادی گزارشات پیشِ خدمت ہیں۔ ان دونوں پر آپ الحمدللہ ایک عرصے سے مسلسل قابل تحسین کوششیں کر رہے ہیں لیکن ان کو اور مضبوط اور مربوط بنانے اور اس کے دائرے کو پھیلانے پر مزید کام کی ضرورت ہے۔ میری رائے میں انہی سے اس سیلاب کے آگے بند باندھا جا سکتا ہے۔ آپ کی تجاویز میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے لیکن میرے خیال میں یہ دو کام اولین ترجیح کے متقاضی ہیں اور اس کے بغیر جو بھی کام ہوگا ناپائیدار ہوگا۔

ا۔ تعلیمی نظام کی تشکیلِ نو کا عملی طریق کار

ہم سب یہ بات سمجھتے ہیں کہ اس روبہ زوال امت مسلمہ کی تشکیل نو کا ایک اہم بلکہ میری نظر میں اہم ترین پہلو تعلیم ہے اور معمارانِ قوم (اساتذہ) اور سردارانِ قوم (سیاسی و مذہبی

---

[۱] ڈائریکٹر پشاور میڈیکل کالج و پرائم ایجوکیشن فاؤنڈیشن

لیڈروں) کو اس کی اہمیت کا احساس دلانا نہایت ضروری ہے کہ وہ نظامِ تعلیم کو شعوری طور پر اسلامی تشخص کی از سرِ نو بحالی اور مغرب کی ذہنی غلامی/تہذیب سے نکلنے کی بنیاد سمجھ اور تسلیم کر لیں۔ اور ایسے تعلیمی نظام کی تشکیل کریں جو نوجوانانِ قوم کی دین اسلام کے جامع تصور کے ساتھ ساتھ ان کے باعمل مسلمان بننے کی تربیت کر سکے۔ تاریخ میں تعلیم اور نظامِ تعلیم قوموں کے عروج وزوال کی اہم بنیاد رہا ہے۔ جس قوم نے بھی تعلیم کی اہمیت کو صحیح طریقے سے پہچانا اور اس کے ذریعے اپنے تشخص اور نسل کی تربیت کا انتظام کیا وہ دنیا میں سرخرو ہوئی۔ تعلیم قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا سب سے اہم عنصر ہے اور رہے گا۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ تعلیمی نظام کو جس نہج پر بنایا گیا (جس میں بنانے والے مسلسل تبدیلیاں بھی کر رہے ہیں) اس میں موجودہ سیاسی نظام اور جماعتوں کے ذریعے مطلوبہ تبدیلی بظاہر ممکن نہیں لگتی۔ اسی کے نتیجے میں مادیت ہر چیز کی کسوٹی بن گئی ہے اور الحاد بھی اسی کا ثمرہ ہے اور یہ نہ صرف انسانی رشتوں کی کمزوری اور خدا کے وجود سے عملی انکار کی صورت میں نہ صرف انفرادی زندگی کا حصہ بن گیا ہے بلکہ اسلام کے مقابلے میں ایک نئے ورلڈ ویو کی صورت میں بھی ہمارے لیے چیلنج ہے۔ مغربی الحادی تہذیب اسی کا حصہ ہے۔

تعلیمی نظام کی بنیاد استاد ہے اور جب تک استاد میں تبدیلی نہ آئے تب تک نہ طالب علم میں تبدیلی آسکتی ہے، نہ نظام میں اور نہ قوم میں۔

بدقسمتی سے آج کے استاد کی حالت یہ ہے کہ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ترا وجود سراپا تجلیٔ افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر

مگر یہ پیکرِ خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو، زرنگار و بے شمشیر!

اور اسی المیہ کا ذکر کرتے ہوئے وہ ''استاد'' سے گلہ کرتے ہیں ؎

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاک بازی کا

اس موضوع کی مزید وضاحت پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن خلاصہ یہ ہے کہ مغربی الحادی تہذیب کے سیلاب کے مقابلے کے لیے اوّلین ضرورت ایسے اساتذہ کی تیاری ہے جو بچوں کو ایسی تعلیم دے سکیں جو اسلام کو شعوری طور پر فخر سے اپنی زندگی کا مقصد سمجھیں۔

اس کے لیے ایک بہت بڑی ضرورت نصاب میں تبدیلی کی بھی ہے اور یہ بھی موجودہ سیاسی اور ''جمہوری'' نظام کے نتیجے میں ناممکن لگتی ہے۔ اس کے لیے استاد کی متبادل تربیت (ٹریننگ) کی ضرورت نصاب میں تبدیلی کی بھی ہے اور یہ بھی موجودہ سیاسی اور ''جمہوری'' نظام کے نتیجے میں ناممکن لگتی ہے۔ اس کے لیے استاد کی متبادل تربیت (ٹریننگ) کی ضرورت ہے تاکہ وہ موجودہ تعلیمی نظام کی خباثتوں کو اُجاگر کرسکے اور بچوں کو دین اسلام کی متعلقہ تعلیمات سے نہ صرف آشنا کرسکے بلکہ ان کی حقانیت پر قائل بھی کرسکے۔ اس دائرہ میں سوشل سائنسز کے ساتھ ساتھ تمام دوسرے علوم کو بھی (خصوصاً بیالوجی کو) شامل کرنا ضروری ہے۔ نصاب کا مکمل جائزہ لے کر اس میں موجود منفی رجحانات کے مقابلے میں متعلقہ متوازی مواد (نصاب) تیار کیا جائے تاکہ موجودہ نصاب کے ہر منفی مواد کے مقابلے میں استاد کے پاس متوازی مثبت نصابی مواد موجود ہو اور یہ طلباء کو پڑھایا اور ذہن نشین کروایا جاسکے اور پڑھائی کے دوران حسبِ موقع موازنے کے لیے پیش بھی کیا جاتا رہے مثلاً جب ڈارون کا نظریہ ارتقاء پڑھایا جائے تو وہیں استاد تخلیقِ آدم اور نسلِ انسانی کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر مؤثر طریقے سے بیان کرنے پر قادر ہو، علیٰ ہذا القیاس۔

گوکہ یہ متوازی نظام آئیڈیل طریقہ نہیں لیکن موجودہ حالات میں ایک قابلِ عمل طریقہ ہے جس سے بیماری کا مکمل علاج تو شاید ممکن نہ ہو لیکن اسے مزید پھیلنے سے کافی حد تک روکا جاسکتا ہے۔ یہ ایک صبر آزما لیکن یقیناً قابلِ عمل طریقہ ہے جس کا ابتدائی تجربہ ہم کامیابی سے کرچکے ہیں۔ تعلیمی نظام میں صحیح اسلامی فکر کا الحادی مغربی فکر پر برتری کا شعوری احساس وادراک ہی مغرب کے جاہلی نظام کا مقابلے کرنے کا پائیدار حل ہے۔ اس میں اعداد وشمار اور عالمی حالات کا تجزیہ اور معروضی حقائق کی روشنی میں مغربی الحادی نظام کا تنقیدی جائزہ بھی شامل کرنا اہم ہوگا۔

۲۔رجوع الی القرآن

دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ ہم دین کے بارے میں اپنے بنیادی تصورات کو واضح کریں اور یہ کام ہر سطح پر کیا جائے۔اس کی اولین ضرورت رجوع الی القرآن ہے جس کے بغیر مغربی الحادی تہذیب کے مقابلے کی کوششیں ناتمام ہی رہیں گی۔قرآنی تعلیمات کے تناظر میں نظام ہائے اسلام کے بنیادی خدوخال پر بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق تربیت کی جائے۔الحمدللہ اس پر ایک حد تک کام بھی ہو چکا ہے لیکن مزید اور زیادہ مؤثر کام کی ضرورت ہے جس میں اللہ کا پیغام،مقصدِ حیات اور اسلام کی حقانیت کا جامع تصور بچوں کو ذہن نشین کرایا جائے۔

مجھے حال ہی میں ایک تجربہ ہوا جس کی روشنی میں مجھے یہ یقین ہو گیا کہ سکولوں اور دینی مدارس میں بھی قرآنی فہمی کو مزید بہتر اور مؤثر بنانے کی ضرورت ہے جس میں بنیادی طور پر نزول قرآن کے مقاصد پر زور دیا جائے اور اس کی روح کو سمجھا جائے۔وہ تجربہ یہ تھا کہ جب میں نے ایک مختصر کتابچہ''قرآن کیوں اور کیسے سیکھیں؟''چند دوستوں اور علماء کرام سے نظر ثانی کے لیے شیئر کیا تو معلوم ہوا کہ سب''پڑھے لکھے''دوست اور بعض علماء کرام بھی قرآن نہ سیکھنے کے انجام سے کماحقہ' آگاہ نہ تھے۔قرآن مسلمان کے لیے ایک ایسا لازمی مضمون ہے جس کے بغیر امتحان پاس نہیں ہوسکتا،بے شک وہ باقی سارے مضمون پاس کر لے۔آپ یہ کتاب نیچے دیے گئے لنک سے ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں۔

https//:prime.edu.pk/pf/PublicEducation/Quran_kyun_aur kesy_seekhen.pdf

خلاصۂ کلام

تعلیمی نظام کی تبدیلی اور رجوع القرآن کے بغیر نہ وہ افراد کار تیار ہو سکتے ہیں جو نظام کی تبدیلی کا باعث بنیں اور نہ وہ قوم بن سکتی ہے جو امت مسلمہ کی نشاۃِ ثانیہ کا باعث بنے۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ڈاکٹر طفیل ہاشمی[1]

دو دنوں میں ۳۴ نئی یونیورسٹیوں کو چارٹر دے دیا گیا

تعلیمی انڈسٹری میں حیرت انگیز انقلاب

موجودہ حکومت نے عالم نزع میں پنجاب میں ۳۴ نئی یونیورسٹیوں کے لیے چارٹرز دے دیئے ہیں۔ ایجوکیشن انڈسٹری مبارک باد کی مستحق ہے کہ ڈگریاں فروخت کرنے کے مزید کارخانے کھل گئے ہیں۔ یاد رہے کہ پاکستان میں یہ سب سے سستا اور کامیاب بزنس ہے۔ چند ہزار سالانہ کے بدلے وزٹنگ فیکلٹی رکھ کر لاکھوں روپے سمسٹر فیس وصول کر کے ڈگری دے دینے سے زیادہ نفع بخش کوئی بزنس نہیں ہے۔

ایم اے تک ہم نے دو سالہ نصاب کے تحت یکبارگی امتحان کے ذریعے ڈگریاں حاصل کیں۔ اس کے فوراً بعد سمسٹر سسٹم کا چلن شروع ہوا۔ مَیں نے ریاض یونیورسٹی سے سمسٹر سسٹم کے تحت Applied Linguistics کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اتنی محنت کرنا پڑتی تھی کہ دن رات کا فرق بھول جاتا لیکن پاکستان میں یونیورسٹیوں میں سمسٹر سسٹم کا چلن دیکھا کہ رنگین مزاج ٹیچرز گل وگلاب پر ہی ریشہ خطمی ہو جاتے لیکن عمومی تعلیم میں استاد سلائیڈز تیار کر کے طلبہ کو mail کر دیتا ہے اور وہی سلائیڈز کلاس میں بول کر آجاتا ہے۔ کوئز، اسائنمنٹس، سیشنل، مِڈٹرم اور فائنل سب کچھ اسی میں سے ہوتا اور طلبہ نمایاں کامیابی حاصل کر لیتے۔ اس پر ایجوکیشن انڈسٹری کی برکت سے یہ ہوا کہ ہر سمسٹر میں طالب علم لگ بھگ لاکھ روپے فیس کی مد میں جمع کراتا ہے اسے فیل کر کے ہم اپنی آمدنی کے ذرائع تو نہیں بند کر سکتے۔ طلبہ کو معلوم ہے کہ یونیورسٹیاں ہماری فیسوں سے چلتی ہیں ہمیں پاس کرنا ان کی مجبوری ہے پھر جس طرح اساتذہ طلبہ کے پیپرز کی مارکنگ کرتے ہیں طلبہ بھی اساتذہ کے بارے میں فیڈ بیک دیتے ہیں۔ اگر مجھے اپنی جاب جاری رکھنا ہے، پروموشن لینی ہے تو مجھے طلبہ کی طرف سے شاندار فیڈ بیک چاہیے۔ اور یہ تبھی مل سکتی ہے جب میں ان کو شاندار گریڈ دے کر پاس کروں گا۔ جس کسی

[1] سابق ڈین علوم اسلامیہ، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

نے ہمارے ملک کو اس شاہراہ پر ڈالا ہے اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ پیارا پاکستان ہے اور ہم اس کے نگہبان ہیں۔

ماضی بعید سے شروع کریں اور لارڈ میکالے کی کرم نوازی کا ذکر کریں تو بات لمبی ہو جائے گی۔تاہم پاکستان میں تعلیم کے دونوں سلسلے یعنی دینی اور رسمی قومی امنگوں کے مطابق استوار نہیں کئے گئے۔دینی تعلیم صادق و امین لیکن ہر شعبۂ حیات میں متحرک، مستعد اور زندہ شہری پیدا کرنے کے بجائے امام، خطیب اور دینی تعلیم کے اساتذہ پیدا کرنے تک محدود ہو گئی جبکہ ان افراد کی ضرورت تو تھی لیکن محدود۔ایسا کوئی سسٹم متعارف نہیں کروایا گیا کہ دو چار سال کی لازمی دینی تعلیم کے حصول کے بعد/ ساتھ رسمی تعلیم کا حصول بھی ممکن ہو اور ہم مسلم سیاست دان، متقی بیوروکریٹس، دیانت دار فوجی، امانت دار تاجر اور ایثار پیشہ زمیندار اور صنعت کار تیار کر سکیں۔دوسری طرف رسمی تعلیم کسی حد تک ملک کی مادی ضروریات پوری کرتی تھی لیکن اس میں اسلام و اخلاق کی آمیزش سرے سے نہیں تھی۔پھر جب اسلامیات کی تعلیم لازمی کی گئی تو فرقے سامنے آ گئے۔ہر فرقہ کا اسلام اپنا تھا نتیجتاً بہت کم امور ایسے تھے جن پر فرقہ وارانہ اتفاق ہو سکا اور وہی تین چار باتیں دوسری جماعت سے بی اے تک اسلامیات کے نام سے دہرائی جاتی ہیں۔

درمیان میں سمسٹر سسٹم آ گیا.جن ممالک میں واقعتاً سمسٹر سسٹم رائج ہے وہاں طلبہ کو چوبیس گھنٹے میں چار گھنٹے بھی سونے کے لیے بڑی مشکل سے دست یاب ہیں لیکن اس کے لیے اساتذہ کو بھی بے پناہ محنت کرنا پڑتی ہے.ہمارے ہاں دونوں کام مشکل تھے، ہم نے ہر مضمون کی سولہ پریزینٹیشن تیار کر لیں، انہیں میں سے کوئز، اسائنمنٹ اور امتحان۔ہر طالب علم کو معلوم ہوتا تھا کہ یہ سوال آئیں گے۔اگر کسی طالب علم کی تیاری درست نہ ہو تو استاذ مادی اور دیگر غیر اخلاقی تحائف لے کر اچھے نمبر دے دیتا، اور انہیں کہیں چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔

جنرل مشرف کے دور میں محدود پیمانے پر سیلف فائنانس سکیم کے تحت سیٹیں رکھی گئیں۔عام ادارے بھی آمدنی کے اس ذریعے سے خوش ہوئے لیکن سب سے زیادہ فائدہ ان کی اپنی کمیونٹی کے بالائی طبقہ نے اٹھایا.دھڑا دھڑ پرائیویٹ کالجز اور جامعات بننا شروع ہو گئیں.اور

ملک میں سب سے بڑی انڈسٹری ایجوکیشن انڈسٹری متعارف ہوگئی جو تمام تر سیلف فائنانس پر استوار کی گئی۔ جب تعلیم مارکیٹ کا مال ہوگئی تو یونیورسٹیوں نے اس امر کو عملا رائج کر دیا کہ ڈگری حصول علم کا سرٹیفکیٹ نہیں بلکہ اداء فیس کی رسید ہے۔ سربراہانِ جامعات اپنی فیکلٹی کو بتاتے ہیں کہ جس بچے نے اتنے لاکھ روپے ہمارے ادارے میں جمع کروائے ہیں ہم اسے ڈگری دیئے بغیر کیسے بھیج سکتے ہیں۔ اس سارے عمل کے نتیجے میں ایک طرف غریب اور متوسط طبقے کی استطاعت سے تعلیم نکل گئی اور دوسری طرف وہ کسی اہلیت اور قابلیت کی علامت نہیں بلکہ قوت خرید کا نتیجہ ٹھہری۔

پھر اس پر یہ ستم کہ حاضر سروس اور ریٹائرڈ فوجی آفیسر جامعات کے سربراہ مقرر کرنے کا چلن عام ہوگیا۔ جبکہ یہ معلوم ہے کہ ہمارے ملک میں عسکری قیادت میں شامل ہونے کے لیے ایف اے/ ایف ایس سی پاس ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کچھ لوگوں کے پاس اعلی ڈگریاں بھی آ جاتی ہیں لیکن ان کی کہانی ناگفتہ ہی رہے تو بہتر ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ یہ قیادت آخری درجے کی ترقی پانے کے بعد بھی اکڈیمک طور پر ایف اے سے بلند سطح کی نہیں ہوتی۔ اگر کسی فرد نے کوئی ادارہ بہتر طور پر چلایا ہے تو صرف جامعہ میں موجود مہارت کے تعاون اور مشاورت سے۔

ہم عسکری قیادت کی مختلف شعبوں میں دراندازی سے ہونے والے نقصانات کا ذکر کرتے رہتے ہیں لیکن میری رائے میں سب سے بڑا نقصان شعبہ تعلیم میں ہوا کیونکہ سیاست، صنعت، تجارت اور ریئل اسٹیٹ بزنس کے سٹیک ہولڈرز ملک میں پہلے سے موجود تھے جبکہ تعلیم کا سٹیک ہولڈر کوئی نہیں تھا اس لیے اس کی تباہ حالی کا دکھ کسی کو نہیں ہوا۔

مزید برآں وہ مضامین جو قوموں کی دانش و تہذیب کے ارتقا میں کار ہائے نمایاں سرانجام دیتے ہیں مثلاً فکر و فلسفہ، اخلاقیات، مذہب، تصوف، تاریخ، تہذیب اور دیگر سماجی اور عمرانی علوم وغیرہ سے متعلق تمام مضامین کو بیک جنبش قلم ختم کر کے قومی ترقی کا دار و مدار تاریں جوڑنے اور سکریو ٹائیٹ کرنے کو قرار دیا گیا۔ تعلیم کا تعلق انسانی شخصیت کے ارتقا کی بجائے مادی وسائل کے حصول سے ہوگیا اور کامیابی نے ایک نئے مفہوم کا لبادہ اوڑھ لیا۔

اسلامی ریاست اور مہذب سماج میں تعلیم کبھی بھی برائے فروخت نہیں ہوتی۔ یہ بنیادی

انسانی حق نہیں کہ صاحبِ حق اپنا حق معاف کردے بلکہ تعلیم کا حصول ہر فرد کا فرض ہے، جو نہ چھوڑا جا سکتا ہے نہ معاف ہوسکتا ہے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں کہ جب برصغیر میں مسلمانوں کے لیے تعلیم کے دروازے بند کر دیئے گئے تو یہاں کے مسلم سماج نے اپنی مدد آپ کے تحت ایسے ادارے قائم کئے جو نہ صرف ضرورت مند طلبہ کی کفالت کرتے ہیں بلکہ انہیں کسی بھی قسم کی فیس کے بغیر زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتے ہیں۔

میں دینی مدارس کے قائدین سے گزارش کروں گا کہ پاکستان میں جامعات کا سارا انفراسٹرکچر اگلے دس سال میں دھڑام سے گر کر تباہ ہو جائے گا۔ سرکاری جامعات تو شاید تین چار سال بمشکل نکال سکیں۔ پرائیویٹ جامعات بھی اگر اپنی فیسوں میں قابلِ لحاظ کمی نہیں کریں گی تو اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکیں گی۔

یہ وقت ہے کہ دینی علم، اسلامی حمیت اور ادارہ جاتی تجربہ رکھنے والے افراد اور ادارے سامنے آئیں اور دینی مدارس کے پہلو بہ پہلو سائنسی، عمرانی، سماجی اور اقتصادی مضامین کی تعلیم کے لئے اسلامی فکر و تہذیب کی اساس پر ادارے قائم کریں اور اپنے اداروں کے توسط سے ساری ریاست کو مطلوبہ رخ دینے کی طرف پیش قدمی کریں۔

نسلوں کی تربیت ایسے ہوتی ہے

گرمیوں کی چھٹیاں ہیں۔ ترک حکومت نے اس دوران 90 ہزار مساجد میں بچوں کی دینی تربیت کا بہترین پروگرام شروع کیا۔ ناظرہ، حفظ، منتخب احادیث اور بنیادی دینی معلومات کے ساتھ بچوں کو بہت کچھ سکھایا گیا اور بچے بھی لاکھوں کی تعداد میں اس کورس میں شریک ہوئے۔ حکومتی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ دورانِ کورس صوبائی گورنر جیسے اعلیٰ سرکاری عہدیدار مساجد میں آکر اساتذہ اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ صدر اردگان کا کہنا ہے کہ نئی نسل کو اپنی اصل (دین) کے ساتھ جوڑے بغیر تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس کورس کے فائدے کا اندازہ اس سے لگائیں کہ استنبول کے 5 لاکھ سے زائد بچے آیا صوفیا میں ہونے والی اختتامی تقریب میں شریک ہوئے۔ باقی ملک کا خود ہی سوچیں۔ (المجتمع کویت)

تعلیم و تربیت

حافظ محمد عمران طحاوی

تین اہم تعلیمی موضوعات پر پریس بریفنگ

از مدیر البرہان (صدر تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ، لاہور)

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ کے بانی صدر پروفیسر ڈاکٹر محمد امین صاحب نے ۴/اگست ۲۰۲۳ء بروز جمعۃ المبارک ۴ بجے سہ پہر لاہور پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کے دوران مندرجہ ذیل مطالبات حکومت پاکستان اور حکومت پنجاب کے سامنے رکھے اور اساتذہ وطلبہ تنظیموں اور دینی جماعتوں واداروں سے ان کے حق میں آواز اٹھانے کا مطالبہ کیا:

۱۔ پنجاب میں ایف ایس سی میں کیمبرج یونیورسٹی کی نصابی کتب کا نفاذ

حال ہی میں انٹر بورڈ چیئرمین کمیٹی نے پنجاب کریکلم اینڈ ٹیکسٹ بک بورڈ (PCTB) کو ہدایت کی ہے کہ وہ پنجاب کے ہائر سیکنڈری سکولز میں ریاضی، بیالوجی، فزکس، کیمسٹری اور کمپیوٹر سائنس کی اپنی کتابیں لگانے کی بجائے کیمبرج یونیورسٹی کی کتابیں لگائیں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ جب باقی جماعتوں میں سائنسی مضامین کی کتابیں ٹیکسٹ بک بورڈ کی ہیں تو ایف اے / ایف ایس سی میں کیمبرج یونیورسٹی کی کتابیں کیوں لگائی جائیں جبکہ وہ بہت مہنگی بھی ہوں گی؟

اس سے پہلے اُردو کی بجائے انگلش میڈیم، میٹرک، ایف اے کی بجائے او اور اے لیول اور آکسفورڈ کی کتابوں کے ذریعے مغرب زدہ ماحول کو فروغ دینے کی کوشش کی جا چکی ہے اور قیمتی زرمبادلہ برطانیہ کو جاتا ہے۔ اب اس میں کیمبرج یونیورسٹی کی کتابیں لگانے کی کیا ضرورت تھی؟

۲۔ پنجاب میں قرآن حکیم کی تدریس کے ناقص انتظامات

پنجاب میں قرآن حکیم کے ترجمے کی بطور لازمی مضمون تدریس حکومت پنجاب کا ایک احسن اقدام تھا لیکن اس کے لیے ضروری تقاضے پورے نہیں کیے گئے۔ اس کے لیے اساتذہ نہیں بھرتی کیے گئے۔ جب استاد ہی نہ ہو تو پڑھائے گا کون؟ یہ کام اسلامیات کے موجودہ اساتذہ سے لیا جا رہا ہے لیکن ان کی تربیت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ اسی طرح ٹیکسٹ بک بورڈ نے اس کے

لیے جو نصاب بنایا ہے وہ بھی غیر موزوں ہے۔ اس سب کا نتیجہ یہ ہے کہ ترجمۂ قرآن کی لازمی تدریس غیر مؤثر ہو کر رہ گئی ہے۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تدریس القرآن کے لیے اساتذہ بھرتی کیے جائیں، ان کی تربیت کا انتظام کیا جائے اور اس کے لیے موزوں نصاب بنایا جائے۔

۳۔ بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی کا جنسی سکینڈل

ہم بہاولپور اسلامیہ یونیورسٹی کے جنسی سکینڈل کی مذمت کرتے ہیں۔ ضروری ہے کہ معاملے کی تحقیق کی جائے اور مجرموں کو سخت سزا دی جائے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باقی یونیورسٹیوں کا بھی یہی حال ہے اور یہاں وہاں سے اِکّا دُکّا اس نوع کی خبریں آتی رہتی ہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ مخلوط تعلیم پر پابندی لگائی جائے۔ سمسٹر سسٹم کا خاتمہ کیا جائے۔ خواتین کے الگ کالج اور یونیورسٹیاں بنائی جائیں۔ ان کا نصاب بدلا جائے اور ان کے تعلیمی اداروں میں مردوں کا داخلہ منع ہو۔ یونیورسٹیوں میں نشہ آور اشیاء کی فروخت پر بھی سخت پابندی ہونی چاہیے۔

بقیہ: افغان معیشت ترقی کی راہ پر گامزن

ورلڈ بینک کے ان شائع شدہ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ افغانستان میں نہ فاقہ کشی ہے نہ افراطِ زر ہے نہ بے روزگاری کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ وہاں معاشی استحکام ہے اور ایران اور پاکستان کے مقابلہ میں وہاں معیشت پر حکومت کی گرفت مضبوط ہے۔ معاشی ابتری کی جو تصویر کشی سامراجی ادارے کر رہے ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ حربی جہاد (2002ء تا 2021ء) کے دوران مجاہدین نے جو علاقائی انتظامیہ قائم کی تھی وہی انتظامیہ آج افغانستان کی قومی معیشت کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو افغان عوام کا اعتماد حاصل ہے۔ سامراج کی کوشش ہے کہ حکومت کی اس معاشی گرفت کو کمزور کر دے تاکہ افغان عوام اسلامی حکومت سے بدظن ہو جائیں۔ اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اقوام متحدہ، ورلڈ بینک اور نیٹو کا ہیومینٹرین گروپ طویل المدت منصوبہ بندی کر رہا ہے۔ اس سامراجی تخریب کاری کو ناکام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ حکومت سامراجی اداروں کی اطلاعاتی پیش رفت کو محدود کرنے کے لیے اقدامات کرے بالخصوص ورلڈ بینک کے Third Party Monitoring Agency کے دائرہ کار کی تحدید وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

تعلیم و تربیت

سید خالد جامعی

قومی ریاست میں علماء کرام کی بے قدری (۲)

قومی ریاستیں مذہبی رہنماؤں کو استعمال تو کرتیں ہیں ان کی مانتی نہیں

امریکہ عیسائی قومی ریاست نہیں خدا دشمن و مذہب دشمن ریاست ہے

امریکہ ایک قومی عیسائی ریاست نہیں ہے وہ سیکولر، مذہب دشمن، خدا دشمن، ملحد ریاست ہے لیکن بش نے افغانستان کے خلاف جنگ کے موقع پر عیسائیت کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور کہا کہ میں دنیا کے تمام عیسائیوں کا نمائندہ ہوں۔اس نے چین کے دورے کے دوران افغان طالبان پر حملے کو صلیبی جنگ قرار دیا لیکن بعد میں معذرت کر لی۔صدر بش منگولوں کے علاقے میں اظہارِ یکجہتی کے لیے گئے۔منگولوں کے کپڑے،ٹوپی پہنی اور گھوڑی کا دودھ پیا۔اس اظہارِ یکجہتی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ماضی میں تم نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور مسلمانوں کو غلام بنایا۔آج ہم افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا کر مسلمانوں کو دوبارہ غلام بنا رہے ہیں۔ہم اور تم ایک ہی دائرے کے حلیف ہیں۔مسلمان ہمارے مشترکہ دشمن ہیں۔جو کام تم نے ماضی میں کیا تھا اس کام کو ہم نے حال میں جاری رکھا ہے۔

امریکہ کسی خدا کو نہیں مانتا۔امریکہ خود خدا کا درجہ حاصل کر چکا ہے: رچرڈ رارٹی

امریکہ کو عموماً ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے جہاں عوام کی بڑی تعداد اتوار کے دن کلیسا جاتی ہے۔مذہب بس ایک ذاتی معاملہ ہے، اظہارِ ذات کی ایک کوشش ہے۔مادیت کے سمندر میں واحد سہارا ہے جس سے مصیبتوں میں قرار ملتا ہے مگر امریکی ریاست مذہبی ریاست نہیں۔امریکہ ایک سیکولر، مذہب دشمن اور عیسائیت دشمن ملک ہے مگر جب دل چاہتا ہے قومی مفاد کے لیے عیسائی مذہب کو بھی استنجے کے ڈھیلے کے طور پر استعمال کر لیتا ہے کیونکہ اس سے فائدہ ہوتا ہے۔امریکہ کا سب سے بڑا ریاستی فلسفی امریکی ریاست کے بارے میں جو کچھ کہتا ہے وہ نہایت شرمناک، ہولناک اور اذیت ناک ہے۔بلی گرا ہم جیسے پڑھے لکھے، باشعور،

عصر حاضر سے واقف مذہبی مبلغ کو خود امریکی ریاست اور جدید ریاست کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا اگر وہ امریکہ کے ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی کی کتاب *Achieving our Country* پڑھ لیتے تو انہیں معلوم ہوجاتا کہ وہ جس امریکہ کو ایک مذہبی ملک سمجھ رہے ہیں جو امریکی صدوران سے ایمان، اخلاق، روحانیت حاصل کررہے ہیں اس امریکہ کے بانی، اس کے قیام کی دستاویزات اور اس کے عظیم الشان فیڈرلسٹ پیپرز میں مذہب، خدا، ایمان، روحانیت کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ فیڈرلسٹ پیپرز صرف ۲۴ گورے امریکیوں نے لکھے اور مذہبِ انسانی حقوق کا منشور انہی فیڈرلسٹ پیپرز کی بنیاد پر تحریر کیا گیا۔

امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی کہتا ہے کہ: ''امریکہ دنیا کا واحد ملک ہے جو خدا کی خوشنودی کے حصول کا مدعی نہیں۔ ہم صرف اپنے آپ کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ ہم اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ ہم نے جو بھی جرائم کیے ہیں ان جرائم کے ارتکاب کے باوجود ہم نے اپنے آپ کو خود کو معاف کر دیا ہے۔ یہ لبرل ازم کے جدید انسان (Modern Man)، جدید نفس (Modern Self) کی عالمگیر خدائی کا اعلان ہے۔

جدید ریاست خلقی طور پر (Intrinsically) مذہبی نہیں ہوسکتی

آزادی اور ترقی کی راہ میں اصل رکاوٹ مذہب ہے۔

حیرت ہے کہ اس امریکہ کو بلی گراہم دنیا کے تمام مذہبی رہنماؤں کی طرح ایک مذہبی ریاست سمجھتے رہے جس کا سرکاری فلسفی اس امریکہ کی حقیقت بتارہا تھا۔ انہیں اکیسویں صدی میں میڈیا کے دور میں بھی معلوم نہیں کہ جدید ریاست خِلقی طور پر (Intrinsically) مذہبی نہیں ہوسکتی۔

آزادی، مساوات، ترقی کے عقیدوں کے ساتھ مذہبی تعقل چل ہی نہیں سکتا۔ مذہب خواہ کوئی ہو وہ حلال وحرام، صحیح وغلط، حق وباطل، خیر وشر کے پیمانوں سے آزادی اور ترقی کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ترقی کی بنیادی شرط آزادی اور آزادانہ قرضے ہیں۔ کوئی مذہب ان دو تصوراتِ خیر کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ دنیا کے اکثر مذہبی حلقے جدید ریاست کی حقیقت سے واقف نہیں وہ بس چشمِ تصور، چشمِ تخیل بلکہ تخلیقی تخیل (Creative Immagination) کے ذریعے جدید

ریاست کو معلوم نہیں کیا کیا سمجھ رہے ہیں۔وہ ریاست کے موضوع پر لکھے گئے مباحث،فلسفے پڑھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔نہ اپنے تجربات ومشاہدات سے ریاست کا تجزیہ کرنے کے قابل ہیں۔

علماء کرام کم از کم عزیز احمد کی کتاب ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' پڑھیں

پاکستان کی قومی ریاست کے بارے میں پاکستان کے سب سے پڑھے لکھے چیف جسٹس ،جسٹس منیر نے منیر انکوائری کمیشن رپورٹ میں سب کچھ لکھ دیا ہے۔اس کا خلاصہ پروفیسر عزیز احمد کی کتاب ''برصغیر میں اسلامی جدیدیت'' کے آخری چار ابواب میں موجود ہے۔افسوس ہے کہ پاکستانی علماء نے ان دو مصادر کو کبھی پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔سپریم کورٹ کا یہ ریٹائرڈ چیف جسٹس پاکستان کے آئین اور ریاستی قوانین کا اصل شارح ہے۔ جسٹس منیر وزیر قانون بھی رہے لہٰذا ان کا لکھا ہوا خطابت نہیں حقیقت ہے۔علماء حقیقت سے آنکھیں چرانا چاہتے ہیں تو یہ ان کا مسئلہ ہے حقیقت کا مسئلہ نہیں ہے۔

امریکہ میں مذہبی قوم پرستی اور عالمِ اسلام میں مسلم قوم پرستی کا المیہ قومی مفادات کے تابع مذہب کی تشریحات تک محدود ہے۔مذہب کی آفاقیت کے دعوے مسلسل پسپائی اختیار کر رہے ہیں۔کوئی قومی ریاست کبھی تعقلِ مذہبی کو غالب قوت کے طور پر قبول نہیں کر سکتی۔وہ صرف آزادی،مساوات اور ترقی کے عقیدوں کو تقویت پہنچاتی ہے۔یہی اس کا خِلقی وظیفہ ہے۔

مذہب انسان کو مقامی،قومی،علاقائی نہیں آفاقی بناتا ہے۔وہ قومی ریاست نہیں امت کی تعمیر کرتا ہے۔وہ دارالاسلام تیار کرتا ہے جس کے دروازے ہر مسلم کے لیے کھلے ہوتے ہیں۔مظلوم غیر مسلم حتی کہ یہودی بھی اندلس سے اٹھ کر استنبول میں پناہ لینے چلے آتے ہیں۔

اسلامی تاریخ قوم پرستی کی جدید لعنت سے خالی ہے

اسلامی تاریخ میں کبھی قوم پرستی نہیں رہی،وہاں امت تھی خلیفہ امت کی سیاسی طاقت اور روحانی قوت کا نمائندہ یعنی امیر سیاست اور امیر جہاد بھی تھا۔وہاں قوم نہیں تھی شعوب وقبائل تھے۔وہاں شخصیت پرستی نہیں تھی لہٰذا اسلامی تاریخ میں کبھی بادشاہ کی تاریخ نہیں لکھی گئی بلکہ ہمیشہ امارت،خلافت،سلطنت،تہذیب یا علماء کی تاریخ لکھی گئی یا ان پر کتابیں لکھی گئیں بادشاہوں اور سلاطین کی سوانح نہیں لکھی گئیں۔

اسلامی علمیت اور تاریخ میں ہمیشہ امت کا دفاع کیا گیا، کبھی قوم کا دفاع نہیں کیا گیا۔ جدید ریاست میں عموماً مذہب قوم پرستی کا آلہ کار بن گیا ہے اور قوم پرستی کو مذہبی جواز عطا کر رہا ہے قومی ریاست موقع پرستی کے اصول کے تحت مذہب کے ذریعے اپنے لیے توانائی حاصل کرتی ہے۔ مذہب کو قومی ریاست سے کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی اسی لیے ہمارے مفتی منیب الرحمٰن صاحب نے 'دنیا' اخبار کے کالم میں نہایت دکھ سے لکھا ہے کہ ''پاکستانی ریاست ہمیشہ مشکل وقتوں میں ہمیں یاد کرتی ہے لیکن اچھے وقتوں میں کبھی یاد نہیں کرتی'' سوال یہ ہے کہ جدید ریاست کو علماء کو کیا سمجھتے ہیں اور جدید ریاست کی نظر میں مذہب اور علماء کی اصل حقیقت وحیثیت کیا ہے؟ علماء کو یہ بات اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر مجدد الف ثانیؒ تک امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام مالکؒ کسی نے قوم اور ریاست کے تحفظ کی بات نہیں کی۔ سب نے یقین، ایمان، اسلام، اسلامی اقدار اور امت کے تحفظ کی بات کی۔ ہمارے بڑے ائمہ نے بادشاہِ وقت پر تنقید کی، اس کی مخالفت کی مگر خلافت اور خلیفہ کے امور پر ان کی تنقید، اعتراض، اختلاف کو کبھی خلافت دشمنی، ریاست دشمنی نہیں سمجھا گیا۔ کسی خلیفہ کو قومی سلامتی کا خیال نہیں آیا کہ یہ تنقید خلافت کو کمزور کردے گی کسی خلیفہ نے کسی امام پر ریاست کو کمزور کرنے کا الزام نہیں لگایا۔ نہ کسی عالم کو اپنی تنقید سے ریاست کی کمزوری کا خیال آیا۔ آج ہر مذہب کا عالم قومی ریاست پر تنقید کو مذہب پر تنقید سمجھنے لگا ہے۔ اس کے لیے ریاست کی حفاظت اولیت رکھتی ہے مذہب ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ریاست رہے گی تو مذہب رہے گا۔ ریاست کے بغیر مذہب کا وجود، بقاء ممکن ہی نہیں ہے۔ مذہبی قوم پرستی کے جدید عقیدے نے دریائے تند و تیز کو ایک جوئے آب میں تبدیل کر دیا ہے۔ صحراء ذرہ اور سمندر قطرہ ہوگیا ہے، لہٰذا علماء کی حیثیت بھی اب ذرے اور قطرے کی طرح ہوگئی ہے۔ یہی حال مذہبی جماعتوں اور تحریکوں کا ہے۔ قوم پرستی نے ان سے ان کی آفاقی شناخت چھین لی ہے وہ بھول گئے ہیں کہ بقول اقبالؒ ؎

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

(جاری ہے)

اسلام اور پاکستان

سلیم طارق لون[۱]

اصلاحِ عدلیہ کے لیے چند اہم تجاویز

* ہم سب اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں کہ ہمارا عدالتی نظام ہر سطح پہ عوام الناس کو فوری اور سستا انصاف مہیا کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔

* دیوانی مقدمات ہوں، یا فوجداری، یا دیگر خصوصی قوانین کے تحت قائم مقدمات، تمام عدالتیں، بشمول عدالت عالیہ و عظمیٰ، ان مقدمات کا حتمی فیصلہ کرتے اور سناتے سال ہا سال صَرف کر دیتی ہیں جو کم وبیش 15 سال یا اس سے بھی زیادہ کے طویل عرصہ پر محیط ہوتا ہے۔

* اس دوران مظلوم افراد اور لواحقین کے ساتھ جو بیتتی ہے، وہ کسی عذاب سے کم نہیں۔ تھانوں کے چکر تو شاید چھ آٹھ ماہ میں ختم ہو جاتے ہیں مگر عدالتوں کی چکی بہت باریک پیستی ہے۔ انصاف کی تلاش میں بچے جوان ہو جاتے ہیں اور جوان بڑھاپے کی دہلیز میں قدم رکھ دیتے ہیں۔ انصاف تو دور کی بات ہے، مقدموں کے فیصلے ہونے میں بیسیوں برس گزر جاتے ہیں۔

* پشاور ہائی کورٹ کے ہمارے ایک ریٹائرڈ چیف جسٹس نے بتایا کہ ان کے استفسار پر پشاور سنٹرل جیل میں موجود سزا یافتہ پھانسی کے منتظر 83 قیدیوں میں سے 53 نے بتایا کہ جس قتل کے الزام میں انہیں سزائے موت ہو چکی ہے، وہ قتل انہوں نے نہیں کیے۔

* دیگر بہت سے پہلوؤں کے علاوہ ایک اہم پہلو جس کی طرف سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا، اور جو یقیناً تاخیر کا موجب بنتا ہے، وہ اپیلوں، ریویو (review) اور ریویژن (revision) کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اسے محدود کیا جائے تاکہ فیصلے جلد ہو سکیں۔

---

[۱] (ریٹائرڈ) آئی جی پولیس، اسلام آباد

* موجودہ عدالتی نظام میں مقدمات کے جلد فیصلوں کے لیے ضروری ہے کہ فیصلہ کے خلاف صرف ایک اپیل کا حق ہونا چاہیے جو ضلعی سطح پر سیشن کورٹ میں ختم ہو جائے۔ قتل کے مقدمات کا فیصلہ موقعہ پر ہی جرگہ میں ہونا چاہئے۔ لاکھوں کی تعداد میں سالہا سال سے زیرِ سماعت مقدمات کا جلد فیصلہ کرنے کے لیے موثر قانون سازی اور حکمتِ عملی تیار کی جاے۔

* ہائی کورٹس کا کام ماتحت ضلعی عدالتوں کے کام کی نگرانی ہونا چاہیے کہ وہ اپنا کام میرٹ پر اور بلا تاخیر کریں اور نااہل اور کرپٹ عناصر جو عدالتی نظام کا حصہ ہوں بشمول جج صاحبان، پراسیکیوٹر، اور متعلقہ دفتری عملہ ان کا بروقت اور موثر قانونی محاسبہ ہونا چاہیے۔

* سپریم کورٹ آف پاکستان کا کام آئینِ پاکستان اور قوانین کی تشریح اور سپریم جوڈیشل کونسل کی بھرپور اعانت کرتے ہوئے عدالتی نظام سے منسلک کرپٹ عناصر کا موثر انداز میں محاسبہ ہونا چاہیے۔

* عدالتی نظام کی بہتری میں وکلاء کا کردار اور رویہ بھی بہت اہمیت کا حامل ہے۔ جو موجودہ حالات میں انصاف کے بروقت اور موثر حصول میں قطعی طور پر ناکام نظر آتا ہے۔ قانون ہاتھ میں لینے والے وکلاء کے لائسنسز کو فی الفور منسوخ کرنا چاہیے۔

* صدرِ مملکت کو معافی کی درخواست والی شق بھی ختم کی جانی چاہیے۔

* مندرجہ بالا حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے ضرورت اس امر کی ہے کہ حکومت اس نہایت اہم قومی اور عوامی مسئلہ پر فوراً اور بھرپور توجہ دیتے ہوئے اس کا مؤثر اور دیرپا حل تلاش کرے اور اسے فی الفور نافذ کرے۔ اس ضمن میں آئینی اور قانونی ترامیم کی بھی ضرورت ہوگی۔

* اشد ضرورت ہے کہ ایک قومی کمیشن قائم کیا جائے، جو اس سنگین مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر ایک ماہ کے اندر اندر ایک مؤثر اور قابلِ عمل حل پیش کرے جسے بلا تاخیر نافذ کر دیا جائے۔

* یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ اس سے پہلے بھی بہت سے کمیشن تشکیل دیے گئے

جنہوں نے مفید تجاویز دیں مگران پہ کماحقہ عملدرآمد نہ کیا گیا اور عدالتی نظام میں بہتری کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔

* کمیشن کی تشکیل کی تفصیلات:

چیرمین : سپریم کورٹ کے تجربہ کار، قابل، اور نیک شہرت ریٹائرڈ جج صاحب۔

ممبران

- ہائی کورٹ اور سیشن کورٹ کے دو دو تجربہ کار، قابل، اور نیک نام ریٹائرڈ جج صاحبان
- پولیس سروس آف پاکستان کے دو تجربہ کار، قابل، اور نیک نام ریٹائرڈ آئی جی پولیس صاحبان
- دو تجربہ کار، قابل اور نیک نام ریٹائرڈ پراسیکیوٹر جنرل صاحب۔
- پاکستان بار کونسل کے دو تجربہ کار، قابل اور نیک نام نمائندے۔

البرہان

مندرجہ بالا تجاویز میں کچھ اضافے

* موجودہ نظام عدل کی ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ یہ اسلامی اصولوں پر مبنی نہیں۔ اس حوالے سے مندرجہ ذیل اقدامات کی سفارش کی جاتی ہے:

i۔ قانون کی بنیادی تعلیم (ایل ایل بی) میں نصف پاکستانی قوانین اور نصف شریعت کی تدریس ہو۔

ii۔ اس میں عربی زبان، قرآن وحدیث اور فقہ واصول فقہ کی تدریس لازمی ہو۔

iii۔ موجودہ وکلاء اور ججز کی بھی شریعت اسلامی میں تربیت کا اہتمام کیا جائے۔

iv۔ یہ واضح آئینی ترمیم کی جائے کہ عدلیہ کے فیصلے لازماً قرآن وسنت کے مطابق ہوں گے۔

v۔ کسی شخص کو وکالت کی اجازت نہ ہو اور کوئی شخص جج نہ مقرر ہو سکے جب تک وہ جدید قوانین میں مہارت کے ساتھ ساتھ شریعت کا عالم نہ ہو۔

عالم اسلام/افغانستان

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

افغان معیشت ترقی کی راہ پر گامزن

سامراج افغانستان کی معاشی زبوں حالی کی جو تصویر کشی کررہا ہے وہ مستقل جھوٹی ثابت ہورہی ہے۔ اس بات کا اظہار اور اعتراف سامراجی ادارے خود کرنے پر مجبور ہیں۔

افغانستان میں تین سامراجی تنظیمیں معاشی تخریب کاری میں مصروف ہیں۔ ہیومینٹیرین گروپ جو نیٹو کے ممبران پر مشتمل ہے۔ اقوام متحدہ اور ورلڈ بینک۔ افغان معیشت پر اعداد و شمار جمع کرنے کی ذمہ داری بنیادی طور پر ورلڈ بینک کو سونپی گئی ہے۔

افغان معیشت پر تحقیق کے لیے ورلڈ بینک جو سامراجی پروگرام مرتب کر چکا ہے اس کا نام Afghanistan's Future ہے۔ اس سامراجی پیش رفت کے ضمن میں افغان کاروباری شعبہ، گھریلو معیشت اور پیداواری شعبہ جات پر مستقل سروے کیے جاتے ہیں۔ ورلڈ بینک اپنی TPMA(Third Party Monitoring Agency) کے ذریعے مستقل معاشی اعداد و شمار اکٹھا کرتا رہتا ہے اور ان کو ایک ماہنامہ میں شائع کرتا ہے جس کو Afghanistan Economic Monitor کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک ششماہی تجزیہ Afghan Development Update بھی جاری کیا جاتا ہے۔

تازہ ترین افغان اکنامک مانیٹر میں جو اعداد و شمار ورلڈ بینک پیش کررہا ہے اس سے سامراجی پروپیگنڈا کی قلعی کھل رہی ہے۔ ورلڈ بینک کی اس رپورٹ کے مطابق افغانستان میں کوئی معاشی بحران نہیں۔ 2023ء میں افغانستان میں افراطِ زر (CPI inflation) کی شرح میں نمایاں کمی آئی۔ مئی 2023ء تک یہ شرح منفی تین فیصد تھی اور اشیائے خورد و نوش کی قیمتیں 6 فیصد کم ہوئیں۔ مارچ 2023ء سے لے کر جون 2023ء تک پیٹرول کی قیمتوں میں 9 فیصد کمی ہوئی۔ اس دوران خوردنی تیل کی قیمتیں تقریباً 21 فیصد گریں۔ اس دوران خوراک کی قومی پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہوا اور درآمدی خوردنی اشیا پر محصول کم کردیے گئے۔ بازاروں میں رسد اور طلب کا توازن برابر رہا۔ مارچ سے جون 2023ء تک تقریباً 99 فیصد غذائی اور غیر غذائی ضروریات کو پورا کیا گیا۔ کیا یہ ایک فاقہ کش معیشت میں ممکن ہے؟

دسمبر 2023ء سے جون 2023ء تک قومی کرنسی افغانی کی بیرونی شرح تبدل (Rate of exchange) بیش تر غیر ملکی کرنسیوں کے مقابلے میں بڑھتی رہی۔ ڈالر کے مقابلہ میں افغانی 4 فیصد مہنگا ہوگیا۔ پاکستانی روپے کے مقابلے میں افغانی کے شرح تبدل میں تقریباً 20 فیصد اضافہ اور ایرانی تومان کے مقابلہ میں 41 فیصد کا اضافہ ہوا۔ افغان حکومت زرمبادلہ کی ترسیل پر سخت پابندیاں لگائے ہوئے ہے اور کرنسی کے اجرا پر بھی حکومت کا کنٹرول نہایت مستحکم ہے۔ ملک میں کوئی غیر سرکاری زرمبادلہ کی مارکیٹ موجود نہیں۔ 2023ء کی پہلی ششماہی میں بیرونی ممالک سے تقریباً 1.1 بلین ڈالر remittances کی شکل میں افغان معیشت میں داخل ہوئے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ افغان معیشت کا انحصار اقوام متحدہ کے ذریعہ حاصل شدہ زری ترسیل پر مستقل کم ہو رہا ہے۔

بینکوں سے رقومات نکلوانے پر پابندیاں تقریباً ختم کر دی گئی ہیں۔ جو کھاتے اگست 2021ء کے بعد کھولے گئے ان سے رقومات نکلوانے پر کوئی پابندی نہیں۔ غدار حکومتوں کے دور میں جو اکاؤنٹ کھولے گئے ان سے رقومات نکلوانے کی حداب پچاس ہزار افغانی فی ہفتہ کر دی گئی ہے۔ معاشی استحکام اور حکومتی اعتبار میں اضافہ کے سبب بینکوں سے پیسہ نکلوانے کی شرح قدرے کم ہے۔ معاشی نظام میں غیر سیالیت نہیں پائی جاتی اور کاروباری حضرات تمویلی نظام کی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔

2023ء کی پہلی ششماہی میں تمام سرکاری ملازمین کو ان کی تنخواہیں وقت پر ادا کی جاتی رہیں۔ معیشت میں ملازمتوں کے مواقع وافر ہیں اور بیروزگاری کی شرح نہایت کم ہے۔ پیداواری سکت میں مستقل اضافہ کے سبب زرعی اور شہری شعبوں میں پیشہ ورانہ اور غیر پیشہ ورانہ محنت کشوں کی مانگ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں اجرتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔

حکومتی محصولات میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔ 2023ء کے پہلے چار مہینوں میں محصولات کا حجم ساڑھے چھے بلین افغانی تھا جو 2022ء کے پہلے چار مہینوں کے مقابلہ میں 16 فیصد زیادہ تھا۔ کسٹمز ڈیوٹی اور بزنس رسیدی ٹیکس میں اس دوران 23 فیصد اضافہ ہوا۔ اندرونی محصولیاتی ذرائع (وہ جو بیرونی تجارت پر منحصر نہیں) میں 7 فیصد اضافہ ہوا۔ 2023ء کے پہلے چار ماہ میں افغان درآمدات میں 9 فیصد اضافہ ہوا۔ (بقیہ صفحہ نمبر ۳۹)

عالم اسلام/افغانستان　　　　　　سید خالد جامعی

عورتوں کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ (آخری قسط)

افغانیوں کو شرح صدر کے ساتھ روایتی افغان معاشرے کے استحکام کے لیے ڈٹ جانا چاہیے اور آزادئ نسواں، تعلیم اور ترقی کے مغربی ماڈل کو رد کر دینا چاہیے

طالبان کو فلسفی اور سائنس دان اسٹیفن ہاکنگ کا آخری انٹرویو پڑھنا چاہیے جس میں وہ بتاتا ہے کہ اس دنیا کی تباہی اور بربادی میں صرف ایک ہزار برس رہ گئے ہیں۔ یہ تباہی مصنوعی ذہانت (AI)، انفارمیشن ٹیکنالوجی اور ایٹمی ٹیکنالوجی کے باعث آئے گی۔ اس دنیا کے تباہ ہونے سے پہلے دنیا دوسرے کروں (Planetes) میں رہنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ لے.... کیا احمقانہ مشورہ ہے جو دنیا کا سب سے بڑا سائنس داں اور فلسفی پیش کر رہا ہے؟ جدید صنعتوں نے دنیا کو کس طرح تباہ کیا، طالبان اس کی تاریخ پڑھ لیں۔ کیا وہ بھی دنیا کی آلودگی میں اضافہ چاہتے ہیں؟ وہ روایتی صنعتوں، ہوم انڈسٹری کو فروغ دیں۔ اس میں منافع بہت زیادہ نہیں ملتا مگر خود کفالت رہتی ہے۔ لوگ بے روزگار نہیں رہتے اور امارت پر روزگار مہیا کرنے کی ذمہ داری نہیں ہوتی۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جسے بڑی بڑی ریاستیں اٹھانے سے قاصر ہیں۔ ہر جگہ تعلیمی ادارے یونیورسٹیاں کھلیں گی تو پاکستان کی طرح بے روزگاری کا سیلاب آئے گا، کیا طالبان اس کا مقابلہ کر سکیں گے؟

یہ دیکھا جائے کہ صدیوں سے افغانستان ریاست کے بغیر کس طرح اپنی معیشت چلاتا رہا؟ روزگار کے کون کون سے فطری طریقے اختیار کیے گئے؟ ان طریقوں کی حفاظت معیشت کی خود کفالت کے لیے ضروری ہے۔ اپنی تاریخ، روایت میں روزگار کے تجربات اور مغربی تاریخ و تہذیب و معاشیات میں روزگار کے تجربات بالکل مختلف ہیں۔ ان کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے۔ پاکستان نے ایٹمی دھماکہ کیا تو دنیا کے تمام ملکوں نے امداد بند کر دی لیکن پاکستان پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا کیونکہ اس وقت پاکستان میں معیشت اِن فارمل سیکٹر کے پاس تھی، ریاستی دست برد سے باہر تھی۔ معیشت خود کفیل تھی۔ 2007ء کے عالمی معاشی بحران میں

بھی پاکستان پر کوئی اثر نہ پڑا کیونکہ پاکستانی معیشت روایتی معیشت تھی سود، سٹے، منی مارکیٹ، اسٹاک ایکسچینج سے باہر تھی۔ اسلامی بینکوں کے آنے سے پہلے لوگ بینکوں میں اپنی آمدنی یا رقومات جمع نہ کراتے تھے لہٰذا ریاست کو اِن فارمل اکانومی کا اصل حجم معلوم کرنے میں دقت ہوتی تھی اور ان پر ٹیکس لگانا بھی ایک مشکل کام تھا۔ اب ریاست اس اِن فارمل سیکٹر کو اسلامی بینکوں کے ذریعے ٹیکس کے دائرے میں لارہی ہے۔

جدید شہروں میں روایتی معیشت کا شعبہ (Informal sector) بہت وسیع نہیں ہوتا لہٰذا شہروں میں رہنے والے تعلیم یافتہ لوگ ریاست سے نوکری کے مطالبے کرتے ہیں جبکہ آج بھی پاکستان کے تمام دیہی علاقے، جنہیں ہم خوامخواہ پسماندہ کہتے ہیں، ان میں کبھی روزگار دینے کا مطالبہ نہیں ہوتا۔ وہاں روزگار ہوتا ہے روزگار کے مطالبے نہیں ہوتے۔ تمام روایتی تہذیبوں میں روزگار میسر ہوتا تھا اور ریاست پر روزگار کی ذمہ داری نہیں ہوتی تھی۔ نوکری کا مطالبہ صنعتی معاشرے کی تخلیق ہے جس کا بنیادی تعلق اسکولنگ سے ہے۔ اسکولنگ صنعتی معاشرے کی ضرورت ہے روایتی معاشرے کی نہیں۔ روایتی معاشروں میں علم دین کی تعلیم لازماً دی جاتی تھی اور علومِ عقلیہ، پیشے وغیرہ لوگ ماہرین سے سیکھتے تھے۔ روزگار ہر علاقے کے مختلف ہوتے تھے۔ لہٰذا علومِ عقلیہ کی تعلیم بھی اس علاقے کی ضرورت کے مطابق ہوتی تھی۔ یعنی ان علوم کی تعلیم ایک معاشی، سیاسی، ریاستی عمل نہیں بلکہ معاشرتی عمل تھا۔ جدید ریاست کے بعد تعلیم ایک سیاسی، ریاستی فیصلہ ہے۔ چونکہ طالبان نے ابھی تک امارات ِافغانستان کو جدید قومی ریاست میں تبدیل نہیں کیا لہٰذا وہ تعلیم کو سیاسی، ریاستی فیصلہ بنانے کی بجائے اسے معاشرتی دائرے میں ہی رہنے دیں۔ دنیا بھر کے اسلامی اسکولوں سے صرف ایک سوال کرنا چاہیے کہ ان اسلامی اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم ایک جیسی کیوں ہے؟ جب دونوں کے مزاج، طبیعت، طینت، فطرت، جسمانی اعضاء، فرائض بالکل مختلف ہیں تو ایک جیسی تعلیم دینا ایک فطری عمل ہے یا غیر فطری عمل؟ اصلاً اس کا مقصد عورت کو مرد کی طرح نوکری مہیا کرنا جدیدیت اور مغربیت کا تقاضا ہے اور ہمارے مخلص لوگ اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں لیکن ان کے اخلاص و نیک نیتی میں ہمیں کوئی شبہ نہیں۔

طالبان ہر ضلع کو کابل جیسا بنانے کی کوشش نہ کریں۔ اگر افغانستان میں ہر علاقہ کابل جیسا ہوتا تو طالبان کبھی امریکہ سے بیس سال تک گوریلا جنگ نہیں لڑ سکتے تھے۔ شہری علاقے گوریلا جنگ لڑنے کے قابل ہی نہیں رہتے ۔ اگر ہمیں زرعی اشیاء اور اشیائے خوردونوش چاہئیں تو فطری قدرتی علاقوں کو باقی رہنا چاہیے۔ پورے ملک کو جدید شہر بنانا نئے مسائل پیدا کرنا ہے جس کے لیے اربوں روپے کے وسائل درکار ہوں گے۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی اور صوبہ سندھ میں ۲۴ فی صد تعلیم یافتہ نوجوان بے روزگار ہیں۔

24% educated youth in Sindh Jobless [Tribune 13-6-23]

افغانستان پاکستان کے مقابلہ میں کم وسائل کا ملک ہے وہ سوچ لے کہ جدید تعلیم کو عام کرنے کے نتیجے میں بے روزگاری کے سوا کیا پھیل سکتا ہے؟

تعلیم کے موضوع پر چند اہم کتب:

Deschooling society: Lvan illich
Dumbing us down: John Taylor gatto
Weapons of mass instruction: John Taylor gatto
School is dead: Everett Reimer
Caplan against education: Bryan
Goodman growing up absurd: Paul
Goodman compulsory miseducation: Paul
End of education: Neil postman

مغرب نے تعلیم ہی نہیں زچگی کے عمل کو بھی ریاستی سیاسی بنا دیا۔ فرانس میں ریاست زچگی کے مسئلے کو حل کرنے کیسے داخل ہوئی؟ خاندان ریاست کا تابع کیسے بنا؟ اس موضوع پر کتاب 'Policing family' کا مطالعہ مفید رہے گا۔

طالبان کے عظیم الشان ایمان کی علامت یہ تھی کہ انہوں نے اپنے دوست کو دشمن کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ جنرل مشرف کی طرح دوستوں کو امریکہ کے ہاتھوں بیچ کر اربوں ڈالر کما سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ صرف یہ کہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے

نہیں کیا بلکہ ان کو بچانے کے لئے اپنی حکومت بھی قربان کر دی۔ اقتدار کی قربانی بہت بڑی قربانی ہے۔ عصرِ حاضر میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

طالبان کا یہ کارنامہ قیامت تک کے لیے کافی ہے کہ انہوں نے امریکہ سمیت دنیا کے باون ملکوں کو شکست دی جو امریکہ کے حلیف بن کر دہشت گردی کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ صدر بش نے بڑے تکبر سے کہا تھا کہ طالبان سے بات نہیں ہوگی یہ دہشت گرد ہیں، آخری دہشت گرد کے خاتمے تک جنگ جاری رہے گی۔ ہم افغانستان کے غاروں میں جمہوریت کی آزادی کی شمعیں روشن کریں گے۔ دنیا فیصلہ کرے کہ وہ کس کے ساتھ ہے یعنی وہ یہ کہہ رہے تھے کہ کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ اس جنگ میں دنیا کو امریکہ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

سیدھے سادے دیہاتی دہقانی کوہستانی افغانوں نے دنیا کی تین سپر پاور برطانیہ، روس اور امریکہ کو اپنے ایمان سے شکست دی۔ بے سروسامانی ہی ان کا اصل سامان تھی۔ اس کے باوجود وہ فاتح ہوئے۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ امیر المؤمنین ملا عمر رحمہ اللہ کا سادہ ترین طریقۂ حکومت اختیار کریں۔ وہ اشرف غنی اور کرزئی کے دور کے ریاستی دفاتر کے تعیّشات کو ختم کر دیں اور ملا عمر کے گھر کو طالبان کی ایک علامت کے طور پر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیں۔ عربوں نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کے حجروں کو محفوظ نہیں رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان خادم الحرمین الشریفین سے پوچھتے کہ تم ان عالی شان محلوں میں کیسے رہ سکتے ہو جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجرے اتنے سادہ تھے؟ خادم کو یہ حجرے دیکھ کر شرم آتی تھی اور اس خادم کی بے شرمی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ وہ سعودی عرب کو یورپ بنانے کے دعوے کر رہا ہے۔ ملا عمرؒ کے مکان کو اس کی اصلی حالت میں باقی رکھا جائے اور اسے آئیڈیل طرز زندگی کے طور پر پیش کیا جائے جسے دنیا کا ہر آدمی اختیار کر سکتا ہے۔ سائنس میں آئیڈیل مشین وہ ہوتی ہے جس کا داخل (Input) اور خارج (Output) برابر ہو لیکن فزکس آج تک ایسی مشین ایجاد نہیں کر سکی۔ عموماً آئیڈیل اس کو سمجھا جاتا ہے جس کا حصول ناممکن ہو لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسا آئیڈیل طرزِ زندگی پیش کیا کہ اس سے زیادہ سادہ زندگی بسر کرنا ممکن نہیں۔ امیر اور غریب دنیا کے ہر خطے میں اس طرزِ زندگی کو اختیار کر سکتا ہے۔ امیر المؤمنین ملا عمرؒ نے اسی طرز زندگی کی تقلید کی۔ طالبان کے لئے بھی اسی طرز زندگی کو آئیڈیل ہونا

چاہیے۔

اس طرز زندگی پر بعض اسلامی تحریکوں کے احباب طنزاً پوچھتے ہیں کہ طالبان کیا کر رہے ہیں اور کیا کرلیں گے؟ ان کی خدمت میں ہم یہی عرض کرتے ہیں کہ اگر طالبان کچھ نہیں کر رہے، کچھ نہیں کر سکیں گے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کا اصل کارنامہ تو یہ ہے کہ انہوں نے سائنس پر پوری دنیا کے ایمان بالغیب کا خاتمہ کر دیا۔ وہ علماء جو سائنس وٹیکنالوجی سے مرعوب تھے طالبان نے ان کو بتا دیا کہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت ورسائنس اور طاقت ور ترین ٹیکنالوجی ایمان کو شکست نہیں دے سکتی لہٰذا یہ دعویٰ نہایت احمقانہ ہے کہ سائنس کا مقابلہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا مقابلہ ٹیکنالوجی سے ہی ممکن ہے۔ اصل چیز قوتِ ایمانی ہے، یہ ہر طاقت کو شکست دے سکتی ہے۔ برطانیہ، روس، امریکہ دنیا کی تین عظیم سائنسی طاقتیں تھیں تینوں نے افغانی ملا سے شکست کھائی۔ مُلا کو طنز کے طور پر دیکھا جاتا ہے مگر اس مُلا نے عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔

طالبان مغرب، امریکہ، UNO اور دنیا کی تمام قوموں کو بتا دیں کہ تمہارا ہیومن رائٹس چارٹر.... انسان کو اس وقت تک انسان نہیں مانتا جب تک کہ وہ انسان کسی ریاست کا شہری (Citizen) نہ ہو۔ اگر کوئی انسان کسی ریاست کا شہری نہیں تو ہیومن رائٹس چارٹر اسے انسان تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں Human Right کا صرف اور صرف ایک ہی مطلب ہے Citizenship Right شہری حقوق .... حقوق انسانی کا یہ منشور فیڈرلسٹ پیپرز کی بنیاد پر تیار کیا گیا۔ اس کی تیاری صدر روز ویلٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلٹ کی نگرانی میں ہوئی۔ انسانی حقوق سے پہلے ایک قومی ریاست کی ضرورت تھی جو لوگوں کو حقوق دے لہٰذا جدید ریاست کو خدا کا درجہ دیا گیا اور انسان کو اس کا بندہ بنایا گیا۔

قومی سرحدوں کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسان برابر نہیں۔ اگر سب انسان منشور انسانی حقوق کے تحت برابر (Equal) ہوتے تو سرحدیں قائم کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

پاوندے جیسی صدیوں سے ایک علاقہ سے دوسرے علاقے کی طرف نقل مکانی کرتے رہتے تھے لیکن قومی سرحدوں کے قیام کے بعد نقل وحرکت ناممکن ہے۔ یہ کسی ملک کے شہری

نہیں لہذا کوئی ملک ان کو شہریت دینے پر تیار نہیں۔ امریکہ میں کورونا کے زمانے میں امریکی حکومت نے ہر امریکی کو پچیس سو ڈالر ماہانہ رقم ادا کی لیکن جب تارکین وطن (Immigrants) امریکی حکومت سے یہی وظیفہ لینے گئے تو انہیں کہہ دیا گیا کہ تم امریکی شہری نہیں لہذا تم انسان بھی نہیں لہٰذا تمہارے حقوق بھی نہیں۔ اگر منشورِ انسانی حقوق قومی ریاست کی شہریت کی پابندی نہ لگاتا تو ہر انسان انسان ہوتا اور اپنی پسند کی جگہ آباد ہوسکتا تھا۔ پاکستان میں پچاس لاکھ افغان بھائی آئے۔ پاکستان نے ان کو مہاجر (Refugee) قرار دیا۔ یہ پاکستان کے شہری نہیں تھے لہٰذا انسان نہیں تھے لہٰذا ان کو انسانی حقوق بھی نہیں دیے گئے۔ یہ الیکشن میں ووٹ نہیں ڈال سکتے تھے، عدالت نہیں جاسکتے تھے، ان کو صرف کیمپ میں رہنے کی اجازت تھی، کیمپ سے باہر نقل وحرکت کی آزادی نہیں تھی کیوں کہ یہ پاکستان کے شہری نہیں تھے۔ یہ آزادانہ نقل وحرکت نہیں کر سکتے تھے، یہ انسان نہیں تھے لہٰذا ان کو حقوقِ انسانی (Human Rights) بھی نہیں دیے گئے۔

طالبان کی امارتِ اسلامی دارالاسلام تھی جو دارالسلام (جنت) تک لے جاتی ہے۔ دارالاسلام قوم پرستی کی بنیاد پر نہیں بنتا وہاں ہر مسلمان بغیر اجازت آ سکتا ہے اور ہر وہ شخص جس کو امارت آنے کی اجازت دے۔ ہزاروں عرب جہاد کے لئے امارت میں آئے انہیں امارت کا فرد سمجھا گیا۔ تحریکِ پاکستان میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ پاکستان دارالاسلام ہے ہندوستان دارالحرب لہٰذا لوگ پاکستان کی طرف ہجرت کی تیاری کریں۔ لیاقت نہرو پیکٹ کے بعد ہجرت بند کر دی گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ ہندوستان میں رہیں پاکستان نہ آئیں وہ وہاں محفوظ ہیں۔ پیکٹ میں ان کی حفاظت کی ذمہ داری ہندو نہرو کو دی گئی۔ دارالاسلام ۱۹۵۰ء میں قومی ریاست میں تبدیل ہوگیا۔ ہندوستان کے مسلمان ہندوستان کے شہری تھے لہذا وہ پاکستان نہیں آسکتے تھے کہ وہ پاکستان کے شہری نہیں ہیں حالانکہ پاکستان ہندو اکثریتی علاقوں میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے بنایا گیا تھا۔

امید ہے کہ طالبان کبھی قومی ریاست نہیں بنیں گے۔ وہ دنیا کو یہ بھی بتا دیں کہ اسلام میں دینی علم حاصل کرنا فرض ہے حق (Rright) نہیں۔ دینی علم کے حصول کے بعد ہر شخص

معاش کے لیے جو ہنر سیکھنا چاہے سیکھے۔علوم ِعقلیہ حاصل کرے جو شریعت کے تابع ہوں تو ان کے حصول کی اجازت ہے مگر فرض نہیں۔ اسلام میں فرد کے لیے احکام ہوتے ہیں اور رشتوں کے لیے حقوق لہذا یہ کہنا کہ منشورِ انسانی حقوق خطبہ حجۃ الوداع سے نکلا ہے محض جہالت اور ضلالت ہے کیوں کہ خطبہ حجۃ الوداع میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطاب ان انسانوں سے ہے جو مسلمان ہیں۔ اسلام لانے کے بعد وہ اللہ کی رحمت کے یکساں امیدوار ہو سکتے ہیں، ان پر ان تمام احکام کا اطلاق ہوگا جو شریعت نے بتائے ہیں۔خطبہ حجۃ الوداع میں اس انسان کا تذکرہ ہے جو صرف انسان نہیں بلکہ عبد ہے، اللہ کا بندہ ہے اور جب وہ اللہ کا بندہ بن گیا تو اس کے حقوق کفار، ذمی، معاہد، مشرک، اہل کتاب سے الگ ہوں گے۔ اگر تمام انسان برابر تھے تو سورۃ التوبہ کیوں نازل ہوئی؟ کفار و مشرکین کو چار مہینے کی مہلت کیوں دی گئی کہ وہ اسلام قبول کرلیں، جلاوطن ہوجائیں یا قتال کے لئے تیار ہوجائیں؟

اگر خطبہ حجۃ الوداع میں تمام انسانوں کو (یعنی کافر مشرک ملحد زندیق اہل کتاب) کو برابر قرار دیا گیا تھا تو سورۃ التوبہ کیوں نازل کی گئی؟ اسلام میں تمام عبد برابر نہیں ہوتے۔ کافر، مشرک، منافق، فاجر، معاہد، اہلِ کتاب مسلمان سب کے درجات مختلف ہوتے ہیں اور سب کے لئے الگ الگ ہدایات ہیں۔ مسلمان کو کفار پر برتری حاصل ہے کیوں کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہیں۔لہٰذا ہر مسلم کو ہر کافر پر فوقیت حاصل ہے۔ کافر مسلم کے برابر نہیں ہوسکتا۔

طالبان مغرب کو بتا دیں کہ ہم تمہارے ہیومن رائٹس چارٹر کو نہیں مانتے۔ یہ چارٹر ہر شخص کو ضمانت دیتا ہے کہ جو شخص جو کہنا چاہے کہہ سکتا ہے۔ جو بکواس کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ یہ عقیدۂ آزادئ اظہارِ رائے کہلاتا ہے (Freedom of Expression)۔ اس عقیدۂ آزادئ اظہارِ رائے اور اس منشور کی وجہ سے ...توہینِ قرآن اور توہینِ رسالت جائز ہے۔ حیرت ہے کہ عالمِ اسلام کے لوگ سویڈن سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ قرآن جلانے کی مذمت کریں۔ وہ مذمت تو کریں گے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے مگر وہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ ہمارے یہاں ہر شخص کو آزادی ہے جو چاہے کرے، صرف ریاست کے خلاف کچھ نہ کرے۔ اوباما نے اپنی تقریر میں یہی تو کہا تھا کہ توہین رسالت کے مسئلے کا حل توڑ پھوڑ نہیں ہے بلکہ توہین رسالت کی

اورآزادی دو۔اورآزادی دواس کی تقریر پڑھیے:

"We have taken these positions because we believe that freedom and self-determination are not unique to one culture. These are not simply American values or Western values - they are universal values.

Here in the United States, countless publications provoke offense. Like me, the majority of Americans are Christian, and yet we do not ban blasphemy against our most sacred beliefs. As President of our country and Commander-in-Chief of our military, I accept that people are going to call me awful things every day - (laughter) - and I will always defend their right to do so. (Applause.)

Americans have fought and died around the globe to protect the right of all people to express their views, even views that we profoundly disagree with. We do not do so because we support hateful speech, but because our founders understood that without such protections, the capacity of each individual to express their own views and practice their own faith may be threatened.

We do so because given the power of faith in our lives, and the passion that religious differences can inflame, the strongest weapon against hateful speech is not repression; it is more speech - the voices of tolerance that rally against bigotry and blasphemy, and lift up the values of understanding and mutual respect.

But in 2012, at a time when anyone with a cell phone can spread offensive views around the world with the click of a button, the notion that we can control the flow of information is obsolete.

[Remarks from President Barack Obama to the UN General Assembly, New York, 26.09.2012]

ہمارا مضمون ختم ہوا تو اخبار ایکسپریس ٹریبیون کے ذریعے کابل سے ایک نئی خبر موصول ہوئی کہ OIC کے اسلامی اسکالرز اور UNO کے نمائندوں کے ایک وفد نے طالبان حکومت کے عہدے داروں سے ملاقات کی اور ان کو سمجھایا کہ عورت کو تعلیم دینا اسلام کا حکم ہے، یہ دین کا حصہ ہے۔(Education is Part of Islam)اسلامی اسکالروں نے طالبان کو سمجھایا کہ عورتوں پر پابندیوں سے معاشی ترقی متاثر ہوگی۔ معاشی ترقی کے لئے عورت کی تعلیم ضروری ہے۔

UNO کے مطابق افغانستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں عورت کو چھٹی جماعت سے آگے تعلیم نہیں دی جاتی نہ نوکری کرنے دی جاتی ہے جبکہ افغان عوام اور طالبان رہنما عورتوں کی تعلیم کے حامی ہیں لیکن طالبان کی اصل قیادت جو اقتدار میں نہیں ہے مگر اقتدار کو چلا رہی ہے(De facto Authorities)وہ عورت کی تعلیم اور نوکری کے خلاف ہے۔سوال یہ ہے کہ اسلام نے جس تعلیم کا حکم دیا ہے وہ دینی تعلیم ہے یا معاش حاصل کرنے کی تعلیم؟ عورت نوکری کرے گی تو گھر کا، بچوں کا، بوڑھوں کا کیا ہوگا؟ اسلام مخلوط معاشرت کی اجازت نہیں دیتا مخلوط معاشرت میں پردے کا کیا ہوگا؟ طالبان UNO سے کہہ دیں کہ ہمیں عورت کے ساتھ کیا کرنا ہے وہ ہمیں شریعت نے بتا دیا ہے۔جن لوگوں کو شریعت پسند نہیں OIC کے ممالک اور UNO ان لوگوں اور عورتوں کو افغانستان سے لے جائے اور اپنے ملکوں کی شہریت دے دے ہمیں شریعت نہ سکھائے۔ہم شریعت کو OIC کے ماڈرن اسکالرز سے زیادہ جانتے ہیں شریعت آج نہیں بنی پندرہ سو سال سے چل رہی ہے۔تفصیلات کے لیے دیکھیے(Express Tribune 7-7-2023)

مضمون کا خلاصہ درج ذیل ہے:

* شریعت نے طے کر دیا ہے کہ عورت کا اصل مقام، دائرہ، کام کی جگہ اس کا گھر ہے۔ وہ مرد کے شانہ بشانہ اداروں میں کام کرنے کے لیے پیدا نہیں کی گئی۔مغرب سے یہ بات کہنے میں کیا رکاوٹ ہے؟ کیا مغرب کے کہنے پر ہم نص بدل دیں؟

* اسلامی تحریکیں عورت کے بارے میں دفاعی ہوگئی ہیں۔ وہ مغرب سے کہہ دیں

"قرن فی بیوتکن" کے حکم میں اجتہاد نہیں ہوسکتا۔

* طالبان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے سائنس پر دنیا بھر کا ایمان بالغیب ختم کر دیا انہوں نے بعض مسلم علماء کے اس فلسفے کو بھی باطل قرار دیا کہ سائنس کا مقابلہ سائنس سے اور ٹکنالوجی کا مقابلہ ٹکنالوجی سے کیا جا سکتا ہے۔ اصل قوت ایمان ہے جس کے سامنے سائنس وٹکنالوجی کی کوئی حقیقت نہیں۔

* طالبان نے دنیا کی تین بڑی سائنسی قوتوں برطانیہ، روس اور امریکہ کو شکست دی۔

* طالبان خدانخواستہ حکومت نہ چلا سکے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ امریکہ کو شکست دینا اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے سامنے دیگر کام ہیچ ہیں۔

* طالبان نے عالمِ اسلام کی اسلامی تحریکوں، مسلم مفکرین اور علماء کو یہ ثابت کر کے دکھا دیا کہ سائنس کا مقابلہ سائنس سے ٹکنالوجی کا مقابلہ صرف ٹکنالوجی سے نہیں صرف اور صرف ایمان سے بھی ممکن ہے۔

* ہیومن رائٹس چارٹر کے تحت کوئی بھی شخص کسی مذہبی کتاب، مذہبی شخصیت کی توہین کر سکتا ہے۔ یہ اس کا بنیادی حق ہے جو چارٹر نے دیا ہے۔ علماء اس چارٹر کو باطل قرار دیں۔ جو لوگ چارٹر کو خطبہ حجۃ الوداع کا عکس کہتے ہیں وہ چارٹر کی حقیقت سے ناواقف ہیں، سادہ لوح ہیں، اصل فتنہ یہ چارٹر ہی ہے۔

* دنیا میں صرف طالبان ہی ہیں جو UNO اور امریکہ سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا فرانہ چارٹر کو ہم نہیں مانتے۔ اس کی علمیت اسلامی علمیت کی دشمن ہے۔ انہیں یہی کہنا چاہیے۔

* اوباما نے UNO میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ توہین رسالت کے مسئلے کا حل توڑ پھوڑ، احتجاج نہیں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ توہین رسالت کی اور آزادی دو اور آزادی دو۔ آزادی ایک عالمی قدر ہے ہم اس کا تحفظ کریں گے۔ اس تقریر کے بعد اردگان، محمد مرسی، احمدی نژاد نے تقاریر کیں لیکن کسی نے نہیں کہا کہ اگر آزادی کا یہ مطلب ہے تو ہم ایسی آزادی کو نہیں مانتے۔

* ہیومن رائٹس چارٹر کو خطبہ حجۃ الوداع سے ثابت کرنے والے پہلے فیڈرلسٹ پیپرز

(Fedralist papers) پڑھ لیں جن سے یہ چارٹر بنا۔ حجۃ الوداع میں جو انسان مخاطب ہیں وہ مسلمان ہیں اور صحابہ کرامؓ ہیں۔ اگر تمام انسان برابر تھے تو سورۃ التوبہ کیوں نازل ہوئی اور مشرکین کے قتال کا حکم کیوں آیا؟

* مغرب کا افغانستان سے مطالبہ ہے کہ وہ عورت مرد کو Mass Education مہیا کرے۔ اس عمل کے نتیجے میں Mass Migration ہوگی۔ پوری دنیا کا یہی تجربہ ہے لوگ اپنے گاؤں، گوٹھ، آبائی علاقے چھوڑ کر اپنی جڑ بنیاد سے الگ ہوجائیں گے۔ سرمایہ دارانہ نظام یہی چاہتا ہے تاکہ لوگ روایتی اجتماعیتوں سے نکل کر انفرادیت پسندی اختیار کریں لہٰذا سرمایہ داری انسانی معاشروں کے لئے تین کارنامے انجام دیتی ہے:

Displacement, Dispossesion, Alienation پوری دنیا کا تجربہ یہی ہے۔

* گائی ایٹن نے اپنی کتاب *King of the Castle* میں لکھا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک امریکہ کے ۹۹ فی صد لوگ اپنے کام کرتے تھے مگر انیسویں صدی کے اختتام پر اکثر لوگ ریاست، کارپوریشن، کمپنیوں میں ملازمت کرنے لگے یعنی ان کے آزاد کاروبار ختم ہوگئے اور وہ سرمایہ دارانہ نظامِ ریاست اور حکومت کے ملازم بن گئے۔ کیا طالبان یہی چاہیں گے؟

* عورت مرد کو ایک جیسی تعلیم دینے کا مطلب یہ ہے کہ عورت کو مرد کی طرح نوکری بھی دو۔ جب یہ عورت مارکیٹ جائے گی تو بچے ڈے کیئر سینٹر اور بوڑھے اولڈ ہوم میں جائیں گے۔ نوکری کا مطلب ہے مخلوط معاشرت جس کا لازمی نتیجہ زنا کاری کے مواقع کی کثرت ہے۔

* کیا عورتوں کو جدید تعلیم نہ دینے پر طالبان میں اتفاق نہیں ہوسکا؟ جدید تعلیم ہر عورت کا ہی نہیں ہر مرد کا بھی حق نہیں۔ اس کا تعلق صنعتی معاشرے سے ہے۔ معاشرہ صنعتی نہ ہو تو یہ تعلیم بے کار ہے اور بے روزگاری پیدا کرے گی۔ افغانستان جدید تعلیم دے کر کیا بے روزگاروں کی فوج پیدا کرنے کا خطرہ مول لے گا؟

* امت کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں عورت کو جتنی جس قدر تعلیم دی گئی ہے وہ دین و دنیا میں کامیابی کے لیے کافی ہے۔ اس میں کچھ اضافہ کیا جا سکتا ہے لیکن عورتوں کو مرد جیسی تعلیم

دینے کا مطلب ہے عورت کو مرد بنانا جس کے نتیجے میں خاندان کا خاتمہ ہوجائے گا۔

* دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں، مذہبی اور دعوتی جماعتوں کے قائم کردہ اسکولوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ہی طرح کا مغربی نصاب پڑھایا جاتا ہے جب کہ شریعت کے مطابق عورت اور مرد کا دائرہ کار ہی مختلف ہے۔ جب عورت کا دائرہ، کام، ذمہ داریاں، مزاج، طبیعت، طینت، عقلیت، جذبات، احساسات، اشیاء کو دیکھنے کا طریقہ سب کچھ مرد سے مختلف ہے تو عورتوں کو عورتوں کی تعلیم کیوں نہیں دی جا رہی۔ کیا ہم مغرب کے مقلد ہیں اور عورت کو مرد کے برابر لانا چاہتے ہیں؟ لڑکیوں کو چائلڈ سائیکالوجی پڑھائی جاسکتی ہے۔ بچوں کی پرورش، بوڑھوں کی نگہداشت کے طریقے سکھائے جا سکتے ہیں۔ گھر بیٹھے ہنر مندی کے کام بھی انہیں بتائے جاسکتے ہیں۔ روایتی طب سے بہت سے اسباق سکھائے جا سکتے ہیں لیکن ہم نے کبھی توجہ ہی نہیں دی کہ ہم لڑکیوں کو لڑکوں جیسی تعلیم دے کر اربوں روپے کیوں ضائع کر رہے ہیں؟ ہمیں یقین ہے طالبان درست فیصلہ کریں گے۔

* فیڈرلسٹ پیپرز لکھنے والے چوبیس گورے مردوں میں سے کوئی ایک بھی خطبہ حجۃ الوداع سے واقف نہ تھا۔

* اگر عورت مرد برابر ہیں تو عورتوں کی فٹ بال ٹیم، کرکٹ ٹیم الگ کیوں ہے؟ عورتوں مردوں کی ٹیم میں کھیلوں کا مقابلہ کیوں نہیں ہوتا؟ یہ سوال ہم مغرب سے پوچھ رہے ہیں جو عورت اور مرد کی مساوات کا قائل ہے۔

* روایتی تہذیبوں اور معاشروں میں خاندان، قبیلہ، برادری سب پیداواری عمل میں شریک ہوتے تھے لہٰذا روزگار ہوتا تھا۔ ریاست کی ذمہ داری روزگار فراہم کرنا نہیں تھی۔ صنعتی معاشرے نے روایتی معاشرے کو ختم کیا اور روزگار کی ذمہ داری ریاست کو دی اور ریاست اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں ناکام ہے۔ بے روزگاری (Uneployment) کی اصطلاح انیسویں صدی سے پہلے کسی تہذیب میں موجود نہ تھی اب تو نئی اصطلاح آگئی ہے Unemployable۔

فقہ و قانون

ڈاکٹر حافظ حسن مدنی [۱]

غیر عورت کے بیضہ سے پیدا شدہ اولاد کی (آخری قسط)

ماں اور والد سے رشتہ داری اور وراثت کے مسائل

☆ **کلوننگ میں خلیات کا ملاپ:** انسان کے جینیاتی خلیات میں خالق کائنات جلّ جلالہُ نے یہ خوبی رکھ دی کہ جب مردانہ جرثومہ، نسوانی بیضہ سے ملتا ہے تو اس میں داخل ہو کر، ایک نئے انسان کی فطری تخلیق کا از خود آغاز ہو جاتا ہے۔ ان تولیدی خلیات میں انسان کی نسلی اور شخصی معلومات کی ساری تفصیلات موجود ہوتی ہیں۔ تاہم آج کل سائنس دانوں نے انسانی جسم کے ہر ہر خلیہ (مثلاً ناخن، لعاب، اُنگلی، خون وغیرہ) میں ان معلومات کو دریافت کرنے میں قابل ذکر کامیابی حاصل [۲] کر لی ہے۔

اب غیر تولیدی خلیات سے انسانی معلومات کو دریافت کر کے اس کو غیر فطری طور پر کسی عورت کے غیر تولیدی خلیات سے ملا کر بھی نئے انسان /جاندار کی تخلیق ممکن ہے، جسے سائنسی زبان میں 'کلوننگ' کہتے ہیں۔ جب کوئی نو ماہ اُٹھانے والی یا دودھ پلانے والی ماں کے غیر تولیدی خلیات دورانِ حمل، اپنی اولاد کے جسم میں داخل ہو کر، اس کے وجود کا اہم حصّہ بنتے ہیں تو بہر حال ان انسانی خلیات سے نسب و نسل کا وہ تعلق از خود جاری نہیں ہو جاتا جو تولیدی خلیات کا خاصہ ہے۔

تاہم جب سائنسی عمل کے ذریعے غیر تولیدی خلیات کی موروثی و نسلی صفات کے امتزاج کا سائنسی عمل کیا جائے گا، تو اس وقت اس غیر تولیدی خلیہ کے احکام بھی تولیدی خلیات والے

---

[۱] مدیر جامعہ رحمانیہ لاہور، وایسوسی ایٹ پروفیسر علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب، لاہور

[۲] اسی بنا پر کسی حادثے وغیرہ میں جن بے جان یا مسخ انسانی جسموں کی شناخت ممکن نہ ہو رہی ہو تو اُن کے غیر تولیدی خلیات لے کر، ان کے اہل خانہ کے جسمانی خلیات کے نمونوں سے ان کی مماثلت چیک کی جاتی ہے۔ پھر لیب رپورٹس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ فلاں ہوائی حادثے یا زیر زمین ڈوبنے والے افراد کے اعضا کے DNA کو ان کے اہل خانہ کے نمونوں سے ملانے پر علم ہوا ہے کہ وہ گم شدہ انسان اب فلاں کیفیت میں ہے۔

ہی ہوں گے اور اس میں ان شرعی احتیاطوں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا، کیونکہ شریعتِ اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں تحفظِ نسل اور حقوقِ قرابت شامل ہیں۔ جو تولیدی خلیات کے طے شدہ شرعی نظام کی پابندی کے بغیر پوری نہیں کیے جاسکتے۔ واضح رہے کہ اولاد کا اپنی والدہ اور والد سے رشتہ ہی نسب و نسل اور تمام رشتہ داریوں کی اساس ہے جس سے آگے بہت سے شرعی احکام کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس لیے انسانی تخلیق میں شرعی لحاظ سے کوئی بدنظمی ،خرابی اور کوتاہی گوارا نہیں [۱] کی جاسکتی۔

بطورِ مثال، کسی مرد کے ناخن اور عورت کے بازو کے خلیات سے ملنے والی معلومات کو کلوننگ کے ذریعے، سائنسی طور پر ملا کر ایک نئے انسان کی تخلیق کا آغاز کیا جاتا اور پھر اس کو رحم مادر میں رکھ دیا جاتا ہے، تو وہاں یہ ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جس مرد و عورت کے خلیات کو ملایا جارہا ہے، کیا ان میں شرعی نکاح کا رشتہ موجود ہے؟ شرعی نکاح کے بغیر ان کے غیر تولیدی خلیات کا ملاپ بھی ناجائز ہوگا، اور اس بنا پر پیدا ہونے والے انسان پر بھی وہی شرعی ضابطے

---

[۱] جیسے حدیث میں مذکور عبد بن زمعہ اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کے ایک بچے کو لینے کے مشہور جھگڑے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے شرعی ضابطہ کی بنا پر بچہ تو عبد بن زمعہ کے حوالے کر دیا۔ تاہم بچے میں سعد بن ابی وقاص کے خاندان سے مشابہت آپ کو محسوس ہوئی یعنی طبعی طور پر وہ بچہ سعد بن ابی وقاص کے بھائی عقبہ کے نطفہ سے تھا، لیکن آپ نے طبعی مشابہت کی بجائے، شرعی حکم کو راجح قرار دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس فیصلے سے عبد بن زمعہ کی بہن اُمّ المؤمنین سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا بنتِ زمعہ اس بچے کی بہن بن گئیں، لیکن طبعی مشابہت کی بنا پر آپ نے سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کو اپنے شرعی بھائی سے پردہ کرنے کا حکم دیا اور اس نے مرتے دم تک اپنی شرعی بہن سیدہ سودہ کو نہیں دیکھا فَمَا رَآهَا حَتَّى لَقِيَ اللهَ (صحیح بخاری: 2053)۔ اس سے ثابت ہوا کہ قرابت داری کے شرعی ضوابط میں شدید احتیاط کا پہلو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ملحوظ رکھا کہ آپ نے نہ تو بچہ طبعی والد (سعد بن ابو وقاص کے خاندان) کو دیا اور نہ شرعی بہن کو اس سے حجاب ترک کرنے کی اجازت دی، تاکہ نسب و نسل اور قرابت داری کے شرعی نظام میں کہیں کوئی رخنہ، خلل اور شبہ باقی نہ رہ جائے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث سے مُشَبَّہات کی تفسیر فرمائی اور اس سے اجتناب کرنے کا حکم ثابت کیا۔ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلال کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سیدہ سودہ رضی اللہ عنہا کو اس بچے سے پردہ کرنے کا حکم دینا ہے، حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قانون اور شرعی اعتبار سے اسے ان کا بھائی قرار دیا تھا مگر اس بات کا قوی شبہ تھا کہ وہ عقبہ ہی کا لڑکا ہو جیسا کہ شکل وصورت کی ہم آہنگی سے پتہ چلتا تھا، اس لیے احتیاط کے پیش نظر آپ نے پردے کا حکم دیا۔ (فتح الباری: ۴/ ۲۹۳)

لا گو ہوں گے جو تولیدی جرثوموں کے ناجائز ملاپ کی بنا پر ہوتے ہیں۔ اسے زنا تو قرار نہیں دیا جائے گا، تاہم نسل میں اختلاط کے ناطے اس کا مرتکب جوڑا اور ایسا کرنے والے ڈاکٹرز اور لیب معاونین سنگین گناہ گار اور مجرم قرار پائیں گے۔ واللہ اعلم

ششم: والد کے ذمے کفالت: والدہ اور والد کے اکثر فرائض کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے۔ والد کا اولاد سے ایک خصوصی تعلق کفالت وحفاظت کا بھی ہے، جیسا کہ قرآن کریم میں ہے کہ

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ﴾ [البقرہ۲:۲۳۳]

''اور جو باپ (باہمی جدائی کے بعد) یہ چاہتا ہو کہ اس کا بچہ پوری مدت دودھ پیے تو مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ اور ماں اور بچے کے کھانے اور کپڑے کی ذمہ داری اس پر ہے جس کا وہ بچہ ہے (یعنی باپ پر) اور یہ خرچ وہ معروف کے مطابق ادا کرے گا۔ مگر کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے گا۔ نہ تو والدہ کو اس کے بچہ کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ ہی باپ کو اپنے بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے۔''

ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سیدہ ہندؓ بنت عتبہ کو ارشاد فرمایا:

"أَنَّ هِنْدَ بِنْتَ عُتْبَةَ، قَالَتْ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ إِنَّ أَبَا سُفْيَانَ رَجُلٌ شَحِيحٌ وَلَيْسَ يُعْطِينِي مَا يَكْفِينِي وَوَلَدِي، إِلَّا مَا أَخَذْتُ مِنْهُ وَهُوَ لاَ يَعْلَمُ، فَقَالَ: خُذِي مَا يَكْفِيكِ وَوَلَدَكِ، بِالْمَعْرُوفِ." [۱]

''بلاشبہ سیدہ ہند بنت عتبہؓ نے عرض کی: اللہ کے رسول! بلاشبہ ابوسفیانؓ بخیل آدمی ہیں اور مجھے اتنا مال نہیں دیتے جو مجھے اور میری اولاد کو کافی ہو، الا یہ کہ میں کچھ مال ان کی بے علمی

[۱] صحیح البخاری: كِتَابُ النَّفَقَاتِ (بَابُ إِذَا لَمْ يُنْفِقِ الرَّجُلُ فَلِلْمَرْأَةِ أَنْ تَأْخُذَ بِغَيْرِ عِلْمِهِ مَا يَكْفِيهَا وَوَلَدَهَا بِالْمَعْرُوفِ)، رقم: ۵۳۶۴

میں لے لوں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:"معروف کے مطابق اتنا مال لے سکتی ہو جو تمہیں اور تمہاری اولاد کو کافی ہو۔"

اس آیت وحدیث سے علم ہوتا ہے کہ اولاد کے علاوہ، والدہ کا خرچ بھی والد کے ذمے ہے۔اور اگر وہ ادا نہ کرے تو معروف حد تک اسے حاصل بھی کیا جاسکتا ہے۔

درپیش مسئلہ کی شرعی وضاحت

مذکورہ بالا مختصر شرعی احکام کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش نظر مسئلہ کا شرعی حل درج ذیل ہے:

ا۔گناہ گار اور اس کے معاونین: شوہر(ج) کے جرثومہ(Sperm) کا، بیضہ والی عورت(ب) سے کسی بھی طرح ملاپ کرانا حرام ہے کیونکہ دونوں میں کوئی رشتۂ نکاح موجود نہیں ہے۔جس میڈیکل ڈاکٹر اور لیب اسسٹنٹ نے بھی یہ کام کیا، وہ شرعِ اسلامی اور پاکستانی قانون کے لحاظ سے مجرم اور شریکِ گناہ ہیں۔اگر دونوں جینیاتی پانیوں میں یہ ملاپ شرمگاہ میں دخول کی بنا پر ہوا ہے تو یہ زنا کا جرم ہوگا، اور اگر ٹیسٹ ٹیوب بے بی یا کسی اور مصنوعی طریقے سے ہوا ہے تو یہ سنگین گناہ ہے۔

بظاہر اس گناہ میں شوہر اور بیضہ والی عورت (ب اور ج) کی مرضی یا علم شامل ہے، تبھی ان سے جرثومہ یا بیضہ حاصل کرنا ممکن ہوا، چنانچہ وہ دونوں اس گناہ کے حصّہ دار ہیں۔ان دونوں کو اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرنی چاہیے۔

جرثومے اور بیضہ والے مرد وزَن کے نطفہ کو جس عورت (الف) نے اپنے رحم میں رکھوایا تو وہ عورت بھی دونوں کے گناہ میں شریک، معاون اور ان سے ناجائز فائدہ اُٹھانے والی (Beneficiary) ہے۔اور قرآن کریم میں ہے کہ:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۖ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝۲﴾ [المائدہ ۵:۲]

''اور تم نیکی،تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، اور تم گناہ اور سرکشی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔اور تم اللہ سے ڈرتے رہو۔بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا عذاب بہت سخت ہے۔''

الغرض دونوں جڑواں لڑکیوں کے علاوہ، اس معاملے کے تمام فریق بشمول ڈاکٹرز

ومعاونین گناہ گار اور بعض صورتوں میں مجرم ہیں۔سب کو اللہ تعالیٰ سے سچے دل سے توبہ کرنی اور اس گناہ پر استغفار کرتے رہنا چاہیے۔

۲۔فریق ب، ج اور د میں وراثت والا کوئی رشتہ نہیں ہے: اسلام کی رو سے جڑواں لڑکیوں (د) کی اصل والدہ بیضہ والی عورت (ب) ہے، جس کی وفات پر اس کی وراثت ملنا ان لڑکیوں کا حق تھا۔ثانیاً، ان لڑکیوں کو ملنے والی دوسری وراثت ان کے جرثومے والے باپ (ج) کی ہوسکتی تھی، لیکن وہ باپ (ج)، بیضہ والی عورت (ب) سے شرعی نکاح نہ ہونے کی بنا پر نہ تو ان لڑکیوں کا اسلام کی رو سے نسب ونسل والا والد ہے، اور نہ ان لڑکیوں سے رکوکوئی نفقہ یا وراثت اس مرد (ج) کو مل سکتی ہے۔ان لڑکیوں (د) اور مرد (ج) میں کوئی نسلی تعلق، اسلام کی نظر میں معتبر نہیں ہے کیونکہ نطفہ کے فریقین میں شرعی نکاح ہی سرے سے موجود نہیں ہے۔ پیچھے عنوان پنجم کے تحت، واضح فرامین نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گزر چکے ہیں۔

۳۔لڑکیوں کا فریق الف اور ج سے تعلق رضاعی والدین کے مماثل ہے: قرآن کریم کے ظاہر الفاظ میں رحم والی عورت (الف) کو بھی ماں قرار دیا گیا ہے جیسا کہ دو آیات کا حوالہ (تیسرے عنوان کے تحت) پیچھے دیا گیا ہے۔اس جنم دینے والی ماں کا تعلق رضاعی ماں کے مثل ہے۔کیونکہ نو ماہ کے دوران اُس نے بہت مشقت اُٹھائی، اور بچیوں نے اس کے جسم سے بہت سا فائدہ لیا، جو رضاعی ماں سے بھی زیادہ ہے۔پھر اس والدہ (الف) نے ان کی پرورش اور نگہداشت بھی کی۔قرآنی الفاظ اور طبعی تعلق وتربیت کی بنا پر اس ماں (الف) کو بھی زیادہ سے زیادہ رضاعی ماں کے حقوق دیے جاسکتے ہیں۔

واضح رہے کہ دورِ نبوی میں تولید کی یہ جدا جدا صورتیں موجود نہیں تھیں، اس لیے صرف اُٹھانے (حاملہ) اور جنم دینے والی ماں کو رضاعی ماں کے مماثل قرار دینا، قرآن کے ظاہر النص کی بنا پر ایک اجتہادی موقف ہے۔ایک احتمال یہ ہے کہ اس رحم والی ماں (الف) کے نسوانی بیضہ والی ماں (ب) سے ناروا تعلق کی بنا پر، مرد (ج) کی طرح اس عورت (الف) کو بھی کلی محروم کردیا جائے۔لیکن حمل وجنم والے قرآنی الفاظ اور رضاعی ماں پر قیاس کرتے ہوئے، جس کا اولاد کے حقیقی والد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، رحم والی ماں (الف) کے اپنی جنم دی ہوئی لڑکیوں (د) کے ساتھ مادریت (Motherhood) کے تعلق کا اعتبار کیا جائے تو رحم والی ماں

(الف) کا شوہر (ج)، ان لڑکیوں کا رضاعی باپ ہوگا۔ رحم والی ماں اور اس کا شوہر اس ناطے، لڑکیوں کے حسن سلوک کا حق دار اور محرم مرد قرار پائے گا۔ تاہم ان میں وراثت، نفقہ اور ولایتِ نکاح وغیرہ کے نسلی حقوق جاری نہیں ہوں گے۔

سورۃ المجادلہ میں جب جنم دینے والی عورت کو اللہ تعالیٰ نے صیغۂ حصر کے ساتھ 'ماں' بیان کیا تو دیگر آیات واحادیث میں مذکور مائیں اس سے خارج نہیں ہوگئیں۔ تاہم حمل وجنم دینے والی ماں کو بیضہ والی ماں کے مماثل قرار نہیں جاسکتا، جیسا کہ شیخ صالح المنجد کے فتویٰ کے الفاظ پیچھے بھی گزر چکے ہیں، آخر الذکر، دونوں ماؤں کے احکام میں فرق کی دیگر وجوہ یہ ہیں:

واضح رہے کہ جو مشابہت اولاد میں جینیاتی پانی کی بنا پر ہوتی ہے، وہ حمل وجنم اور رضاعت والی ماں سے بہت زیادہ ہے۔ آخر الذکر وجوہات کی بنا پر بعض مشابہتوں کا انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اکثر وبیشتر موروثی مشابہتیں جینیاتی پانی کی بنا پر ہی ہوتیں اور اسی سے نسب ونسل کا سلسلہ جاری ہوتا ہے۔ قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں واضح طور پر آیا ہے کہ ہم نے انسان کو پانی /نطفہ سے پیدا کیا ہے۔

والد کا اپنی اولاد سے نسب ونسل کا تعلق بھی حمل وجنم یا رضاعت کی بجائے، دراصل جینیاتی جرثومہ کی بنا پر ہی ہوتا ہے۔ جس سے اگلے سارے رشتہ داری کے حقوق وفرائض جاری ہوتے ہیں۔ اس لیے رشتہ داری میں اصل جینیاتی جرثومہ ہی ہے، جس کے لیے زوجین کا شرعی معتبر رشتہ ہونا ازبس ضروری ہے، بصورتِ دیگر اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

مشاہدہ بھی اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ جینیاتی ماں کی مشابہت، حمل وجنم والی ماں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے اس مشابہت میں 9 اور 1 یا اس سے بھی زیادہ کی نسبت ہو کیونکہ قرآن وحدیث اور مشاہدہ کی رو سے بچہ کی تخلیق ومشابہت کے اصل عامل پانی /نطفہ ہی ہیں۔

☆ حمل وجنم دینے والی ماں کے بارے میں قرآنی الفاظ اور رضاعی ماں سے مشابہت کی بنا پر یہ لازمی ہے کہ عاریتی رحم (Surrogate Mother) کی جائز صورتوں میں ایسی ماں کو اولاد کی ہمدردی اور محبت سے بہر صورت محروم نہ کیا جائے۔ ان جائز صورتوں میں سوکن یا کنیز کی اجازت سے، دوسری بیوی کا بیضہ اس کے رحم میں رکھنا شامل ہے، جیسا کہ بعض علما نے اس اجازت کی صراحت کی ہے۔ تاہم حمل وجنم کو رضاعی ماں کے مشابہ قرار دینا، قرآن کے

ظاہر الفاظ کی بنا پر ایک اجتہاد ہی ہے جو رضاعت کی طرح متفقہ اور منصوص نہیں، اور اس میں اہل علم کی دوسری رائے بھی ہو سکتی ہے۔

۴۔ شرعی احکام کی رو سے اور مذکورہ حالات میں جڑواں لڑکیوں کا بیضہ والی ماں (ب) سے نفقہ و وراثت ملنا حق تھا، جس ماں کا کوئی علم نہیں ہے۔ اب جنم دینے والی ماں، یا اس کے شوہر سے ان کا تعلق نسلی نہیں تو دونوں سے نفقہ اور وراثت کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، تاہم یہ دونوں زیادہ سے زیادہ ان کے رضاعی والدین ہو سکتے ہیں۔ تربیت و کفالت کرنے کے ناطے دونوں لڑکیوں کو ان سے حسن سلوک کرنا چاہیے۔ گناہ میں شرکت یا تعاون کی بنا پر ان 'شبہ رضاعی والدین' اور ان کے اقربا کو اللہ تعالیٰ سے مسلسل استغفار کرنا چاہیے۔ اسلامی معاشرے میں اس طرح کے فساد کو پھیلانا، ان پر اصرار کرنا اور ان کو علانیہ انجام دینا کبیرہ گناہ ہیں جن کے مرتکب لوگوں کو اللہ کی ناراضی اور غضب سے باز آجانا چاہیے۔

۵۔ جب دونوں لڑکیوں کا جنم دینے والی ماں اور اس کے شوہر سے کوئی نسلی تعلق ہی نہیں تو ان دونوں کو لڑکیوں کی وراثت سے بھی کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ اب شوہر کو اپنی بیوی کی ذاتی ملکیت کی وراثت سے وہی نصف حصہ ملے گا جو ایک لاولد جوڑے کو اپنے زوج سے ملتا ہے۔ تاہم ہمدردی اور نیکی کے ناطے لڑکیوں کو اپنے 'شبہ رضاعی والدین' کے ساتھ کوئی نیکی کرتے رہنا چاہیے جن میں مالی حسن سلوک بھی شامل ہے۔ فوت شدہ خاتون (الف) کو بے اولاد قرار دے کر، اس کی وراثت یوں تقسیم ہوگی کہ کل جائیداد کے ۱۸ حصے کر کے متوفیہ کی والدہ کو ۳، دو بھائیوں کو ۴، دو بہنوں کو ۲ اور شوہر کو ۹ حصے ملیں گے۔

٦۔ ارتکابِ گناہ کی بجائے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا اور جائز صورتوں پر انحصار کرنا چاہیے: جب بعض مشکل صورتوں میں اولاد کا حصول ناممکن ہو جائے تو دیگر آزمائشوں اور بیماریوں کی طرح اللہ کے اس فیصلے پر راضی ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایسے حالات میں اسلام نے رضاعی رشتہ داری کا جو حل بتایا ہے، اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ اپنی مجبوریوں کی بنا پر سنگین گناہوں کا ارتکاب اور پاکیزہ رشتوں سے کھیلنے کا کوئی جواز نہیں۔ رشتہ داری اللہ تعالیٰ نے بنائی اور اس کی نعمتِ عظیم ہے اور اس کے حقوق و فرائض بھی اسی نے قائم کئے ہیں، ان میں ہم اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی یا تاثیر پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔

تبصرۂ کتب

لیاقت بلوچ[۱]

''امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل''

از مدیر البرہان

آپ کی طرف سے حال ہی میں مرتب کردہ کتابچہ بعنوان ''امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اوران کا حل۔ پاکستانی تناظر میں'' ارسال کرنے کا شکریہ۔ زیرِنظر کتابچہ عصر حاضر میں امت مسلمہ کو درپیش دو اہم اور بنیادی چیلنجز (زوالِ امت کے اسباب اور مغربی فکر وتہذیب کا غلبہ) اوران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے نئے اپروچ کی ضرورت کے حوالے سے آپ کی بیش قدر علمی/تحقیقی کاوش کا احاطہ کرتا ہے۔

بلاشبہ امتِ مسلمہ اس وقت اپنی تاریخ کے ناک ترین دور سے گزر رہی ہے۔ اخلاقی، تہذیبی، معاشی، معاشرتی، سیاسی، علمی، تحقیقی میدانوں میں دنیا بھر کے مسلمانوں کو جن چیلنجز کا آج سامنا ہے اُس کی مثال ماضئ قریب و ماضئ بعید میں ملنی مشکل ہے۔ دنیا بھر میں ۵۷ ممالک کی حکمرانی اور بے پناہ قدرتی وسائل کے باوجود ہم خود کو امتِ واحدہ بن کر رہنے کے قابل نہیں بنا سکے۔ اس کی بنیادی وجوہات میں سے ایک بنیادی وجہ تو یقیناً بحیثیت امت ہماری فکری واخلاقی پستی بھی ہے لیکن یہ حقیقت بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس فکری واخلاقی پستی اور معاشی ومعاشرتی زوال کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ بے پناہ دولت و وسائل کے باوجود مسلم دنیا کے حکمرانوں نے اپنی آزادی وخودمختاری پر سمجھوتہ کر کے اہلِ مغرب کی تقلید پر آمادگی اور دین اسلام کی حقانیت وعظمت رفتہ سے بے اعتنائی اور بے زاری پر مبنی رویہ اختیار کر کے امتِ مسلمہ کی قیادت سے منہ موڑ لیا ہے۔

اسی سے ملتی جلتی صورتِ حال ظہورِ اسلام سے قبل بھی تھی جب عالم عرب کفر و جہالت کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے میں خالق کائنات کو اپنی مخلوق کی قیادت ورہنمائی کا فکر دامن گیر ہوا۔ اللہ ربّ العزت نے آقائے نامدار، محسنِ انسانیت، خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسی عظیم ترین ہستی کو مبعوث فرمایا تاکہ عالمِ عرب سمیت دنیا بھر کے

[۱] نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان

انسانوں کو کفر و جہالت اور شرک و گمراہی کے راستے سے ہٹا کر ایک مرتبہ پھر وحدانیتِ الٰہی، حقیقی فلاح اور کامیابی و کامرانی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ پھر چشمِ فلک نے دیکھا کہ صرف ۲۳ سال کے قلیل عرصے میں حضور سرورِ کونین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی عظیم ترین قیادت کے زیر اثر صحابہ کرامؓ کی صورت میں امتِ مسلمہ کو ایک ایسی زبردست قیادت میسر آئی جس نے انسانی تاریخ کے قلیل ترین عرصے میں آدھی دنیا تک اپنی حکمرانی کے جھنڈے گاڑ کر پوری دنیا کا جغرافیہ بدل کر رکھ دیا۔ یہ قیادت ہی کی برکات وصفات تھیں جس نے نیل کے ساحل سے لے کر کرتا بہ خاکِ کاشغر ہر سُو، ہر طرف پرچمِ اسلام کو سر بلند، سرخروئی اور فتح و کامرانی سے روشناس کرایا۔ یہی پیغام اس ماہِ محرم الحرام میں سیدنا امام حسین علیہ السلام اور دیگر اہل بیت عظام کی جانب سے میدانِ کربلا میں باطل طرزِ حکمرانی کے سامنے ڈٹ جانے اور جامِ شہادت نوش کرنے تک حق پر قائم رہنے سے ہمیں ملتا ہے۔

آج بھی اگر ہم جذبہ ایمانی کے تحت اللہ کی نصرت پر بھروسہ رکھتے ہوئے اپنی بیش بہا اور بے پناہ قدرتی، مالی، تکنیکی وسائل اور انسانی صلاحیتوں کو یکجا کر کے ایک نئے عزم اور جذبے کے ساتھ اہل مغرب کی تقلیدِ بے جا کو خیر باد کہنے کا عزمِ مصمم کر لیں تو بعید نہیں کہ امتِ مسلمہ حقیقی معنوں میں امتِ واحدہ بن کر دنیا کی امامت وسیادت کے منصب پر ایک مرتبہ پھر فائز ہو۔ افغانستان پر بار بار بیرونی یلغار، روس، امریکہ و نیٹو فورسز کی جارحیت کے مقابلے میں بے سروساماں افغان عوام کو جب ایک دور اندیش، اعلیٰ کردار و اوصاف کی حامل طالبان قیادت میسر آئی تو بظاہر بے سروسامانی کے باوجود اللہ کی نصرت کی بدولت عظیم اور تاریخی فتح نے افغان عوام کے قدم چومے اور اپنے سے کئی گنا بڑے، جدید وسائل اور ٹیکنالوجی سے لیس امریکی، نیٹو فورسز کو شرمناک، ذلت آمیز اور تاریخی شکست سے دوچار کر دیا۔ شاعرِ مشرق علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے بھی اپنی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں اسی جانب اشارہ کیا تھا کہ ؎

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

سبق پھر پڑھ صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا زورِ حیدرؓ، فقرِ بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

جہاں تک اس مقصد کے حصول کے لیے درست طریقہ کار کے انتخاب کا تعلق ہے تو ہماری نظر میں ہر وہ طریقہ جو قرآن وسنت کی طرف سے عائد کردہ حدود وقیود کے اندر رہتے ہوئے اختیار کیا جائے، جیسے ہمارے پیش نظر

۱۔ کسی امر کا فیصلہ کرنے یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے اُس معاملے میں خدا اور اُس کے رسول ﷺ کی ہدایات سے رہنمائی لینا اور دوسری ساری باتوں سے صرف اس حد تک رہنمائی لینا جہاں تک اسلام میں اس کی گنجائش ہے۔

۲۔ اپنے مقصد اور نصب العین کے حصول کے لیے صرف وہی ذرائع اور طریقے اختیار کرنا جو صداقت ودیانت کے پیمانے پر پورا اُترتے ہوں اور جن سے فساد فی الارض کا اندیشہ نہ ہو۔

۳۔ اصلاح اور انقلاب کے لیے جمہوری اور آئینی طریقوں کے مطابق کام کرنا یعنی تبلیغ وتلقین اور اشاعتِ افکار کے ذریعے رائے عامہ کی ذہن سازی اور اصلاح۔

۴۔ نصب العین کے حصول کی جدوجہد خفیہ تحریکوں کی طرز پر نہیں بلکہ کھلم کھلا اور علانیہ کرنا۔

انسانی معاشروں میں سُدھار کے لیے ضروری ہے کہ عامۃ الناس کو ابہام اور مغالطوں میں رکھنے کی بجائے واضح، دوٹوک لائحہ عمل دیا جائے۔ خصوصاً جب پاکستان میں آئین اور اُس کے مندرجات پر اتفاق ہو چکا ہے اور ریاستی نظام کو چلانے کا لائحہ عمل بھی واضح ہو چکا، لہٰذا اب تو تمام مثبت دینی اذہان کو ان پر عمل درآمد کی فکر اور عمل دارآمد نہ ہونے کے اسباب تلاش کرنا ہوں گے۔ ان مقاصد کے حصول اور تقویت کے لیے کوئی بھی جائز طریقہ کار اختیار کر لیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تنقید وتنقیص کی بنیاد پر خیر کا کام کرنے والوں کو ایک دوسرے کے لیے حوصلہ اور تعاون کا باعث بننا چاہیے۔

اللہ ہم سب کو دین اسلام کی سربلندی اور آقائے نامدار خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے لائے ہوئے دین کی اشاعت اور ترویج کے لیے ہمہ گیر گوش رہنے اور اسی حالت میں اس دارِفانی سے رخصت ہونے کی سعادت نصیب فرمائے۔

تبصرۂ کتب

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

ہمارے کتابچے ''مسلم امہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل'' پر جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب اور لیاقت بلوچ صاحب کی تنقید کا جواب

اقامتِ دین کا صحیح منہج

ترجیح کس کی؟ تعلیم و تزکیہ کی یا سیاسی جدوجہد سے قیامِ ریاستِ اسلامی کی؟
کیا تعلیم و تزکیہ سے فرد اور معاشرے کی اصلاح کیے بغیر قیامِ اسلامی ریاست ممکن ہے؟

* ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے کتابچے ''مسلم امہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل۔ پاکستانی تناظر میں'' پر ملک کی دو معروف اور فاضل شخصیات نے تبصرہ کیا ہے۔ جناب لیاقت بلوچ صاحب (نائب امیر جماعت اسلامی پاکستان) چونکہ ایک سیاستدان ہیں لہٰذا انہوں نے حکمت اور ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر تو واضح طور پر بیان کر دیا ہے لیکن ہمارے نقطۂ نظر پر براہ راست تنقید نہیں کی لیکن جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب چونکہ دانشور اور اکیڈیمشن ہیں لہٰذا انہوں نے کھل کر ہمارے نقطۂ نظر پر تنقید کی ہے اور اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ چونکہ ان کا نقطۂ نظر درحقیقت مولانا مودودیؒ کی فکر سے مستفاد ہے اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ ان کو ہم نے جو جواب دیا ہے اس میں جناب لیاقت بلوچ صاحب کے مضمون کا جواب بھی آ گیا ہے۔

* الحمدللہ البرہان کو اختلاف رائے برداشت کرنے کے سلسلے میں یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۲۰۱۹ء میں مدیر کے اسی موضوع پر مقالے کے جواب میں نائب مدیر مرحوم پروفیسر ملک محمد حسین صاحب نے تنقیدی مضمون لکھا جو شمارہ فروری میں چھپا۔ اب موجودہ شمارے کے انگریزی سیکشن میں ادارتی رکن ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا مدیر کے ایک کتابچے پر ایک تنقیدی مضمون طبع ہوا ہے جس کے جواب میں مدیر کی طرف سے یہ وضاحتی شذرہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مَیں اور پروفیسر ملک محمد حسین مرحوم اس اختلاف کے باوجود برسوں اکٹھے کام کرتے رہے اور اب بھی ڈاکٹر انصاری صاحب اور راقم میں محبت و احترام کا رشتہ، ان شاءاللہ، پہلے کی طرح باقی رہے گا۔

* اقامتِ دین کے منہج کے حوالے سے راقم کی اور ڈاکٹر انصاری صاحب کی فکر میں کیا اختلاف ہے؟

میرا موقف یہ ہے کہ معاشرے اور ریاست میں تبدیلی کی اساس فرد ہے لہٰذا جب تک تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس (یا دعوت واصلاح) سے فرد کو تبدیل نہ کیا جائے اور وہ برضا ورغبت اسلامی تعلیمات پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل نہ کرنے لگے، نہ اسلامی معاشرہ قائم ہوسکتا ہے اور نہ اسلامی ریاست۔

- میری رائے میں مسلمانوں کے لیے اسلامی ریاست قائم کرنا بھی ضروری ہے لیکن پچھلے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال سے اسلامی معاشرہ اور ریاست معدوم نہیں ہوئے بلکہ تسلسل سے موجود ہیں۔ ہمیں صرف انہیں اصلاحی جدوجہد سے مثالی اسلامی معاشرہ اور مثالی اسلامی ریاست بنانا ہے۔

- راقم یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ مسلمانوں کے اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے میں اور زوال سے نکلنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام کا غلبہ ہے جسے توڑنے کی کوشش مسلمانوں کو تعلیم وتزکیہ (دعوت واصلاح)، معاشرتی تنظیم اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے اب بھی کرنی چاہیے اور جب وہ مثالی اسلامی ریاست قائم کرلیں تو اس کی قوت کے ذریعے بھی کرنی چاہیے۔

- راقم کے نزدیک تعلیم وتزکیہ (دعوت واصلاح) کی اولیت اور ترجیح مبنی برنص ہے۔ قرآن حکیم کی نصوص اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آپ کا اسوۂ حسنہ اس کا گواہ ہے لہٰذا اس کی ترجیح اور فوقیت سے صَرفِ نظر کرنا غلط ہے۔ مغرب کے توڑ کے لیے سیاسی جدوجہد اور قیام اسلامی ریاست ضروری ہے لیکن جب تک فرد اور معاشرے کی اصلاح نہ ہو، سیاسی جدوجہد نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی اور اسلامی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ یہی وہ بات ہے جو مولانا مودودی نے ۱۹۴۰ء میں علی گڑھ میں اپنی اس تقریر میں کہی تھی جو 'اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟' کے موضوع پر کی گئی تھی۔

* ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا موقف یہ ہے کہ مغربی فکر وتہذیب اور سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کو توڑنے کے لیے سیاسی جدوجہد اور اسلامی ریاست کا قیام ہماری اولین

ترجیح ہونی چاہیے کیونکہ محض تعلیم وتزکیہ اور دعوت و اصلاح سے اس غلبے کو نہیں توڑا جاسکتا۔ ڈاکٹر صاحب تعلیم وتزکیے (دعوت واصلاح) کی ضرورت کا انکار نہیں کرتے لیکن ان کے خیال میں ترجیح سیاسی جدوجہد اور قیام ریاست اسلامی کو ہونی چاہیے کیونکہ اس کے بغیر مغرب کی الحادی فکر وتہذیب اور مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کے غلبے کو توڑ ناممکن ہی نہیں۔ یوں ان کے نزدیک تعلیم وتزکیہ کی اہمیت ثانوی ہے۔

* ڈاکٹر انصاری صاحب کا یہ مؤقف ان کا اپنا نہیں بلکہ جدید اسلامی تحریکوں (بشمول خلافت کی تحریکوں) کا مؤقف ہے جس کی فکری سربراہی کا تاج مولانا مودودیؒ کے سر سجا ہے جنہوں نے نصوص دین کی ایسی تعبیر کی جس نے سیاسی جدوجہد اور قیام اسلامی ریاست کو دین کا بنیادی ہدف اور مسلمان کی پہلی ترجیح بنا دیا اور تعلیم وتزکیہ اور معاشرتی تنظیم کی حیثیت ثانوی ہوگئی بلکہ سیاسی جدوجہد کی مصروفیت کی وجہ سے عملاً اس سے صَرفِ نظر ہوگیا۔ اس غلط روش کو انتہا تک پہنچانے میں جس امر نے مہلک کردار ادا کیا وہ 'اسلامی جمہوریت' تھی جب مولانا مودودیؒ نے مغرب کی الحادی، سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کچھ اسلامی اصول (کاغذی طور پر) داخل کرکے اس کے 'اسلامی' ہونے کا اعلان کردیا اور پھر اسی 'اسلامی جمہوریت' کے ذریعے سیاسی جدوجہد کرکے اقامتِ دین، غلبۂ دین اور قیامِ اسلامی ریاست کی سعی کی، جو ناکام ہوگئی۔ ہماری رائے میں اسے شرعاً اور عقلاً بھی ناکام ہی ہونا تھا جبکہ جماعت کی ۷۵ سالہ ناکام سیاسی جدوجہد اس کا عملی ثبوت ہے۔ (مولانا اور جماعت کی دیگر دینی خدمات کا ہم انکار نہیں کررہے)۔ مولانا اور جدید دینی تحریکوں کی فکر کی اس غلطی کے پیچھے ان کا اسلامی زوال کے اسباب کو پوری طرح نہ سمجھنا، عہد نبوی اور خلافتِ راشدہ میں غلبۂ اسلام کے منہج کا صحیح ادراک نہ کرنا اور اس ضمن میں وارد نصوص کی غلط تعبیر کرنا ہے۔ تہذیبِ مغرب کے غلبے کے ردّعمل کا شکار ہوجانا اور فکر مغرب سے شعوری وغیر شعوری مرعوبیت بھی اس کا سبب بنی ہے۔

امام طبریؒ نے اپنی تفسیر میں امام قتادہؒ اور دیگر تابعین سے روایت کیا ہے کہ اقامتِ دین کا مطلب ہے "ان یعمل بہ" کہ وہ دین پر عمل کرے۔ جب نماز کھڑی ہوجاتی ہے تو ہم تکبیر تحریمہ میں کہتے ہیں "قد قامت الصلوٰۃ" کہ جماعت کھڑی ہوگئی ہے گویا جس نے نماز نہیں

ادا کی اس نے اقامتِ نماز نہیں کی۔جس مسلمان نے اپنی ذاتی زندگی میں دینی تعلیمات پر عمل نہیں کیا گویا اس نے اپنی ذاتی زندگی میں دین قائم نہیں کیا۔اگر اس مسلمان کی اجتماعی زندگی میں مثلاً ریاست میں کوئی ذمہ داری تھی مثلاً وہ وزیر اعظم تھا اور اس کے ذمے مسلم حکومت کے شرعاً جو فرائض تھے، وہ اس نے ادا نہیں کیے تو اس نے اجتماعی زندگی میں بھی دین قائم نہیں کیا۔ ریاست چونکہ افراد ہی پر مشتمل ہوتی ہے اور اس میں دینی احکام پر عمل مسلمان افراد ہی نے کرنا اور کرانا ہوتا ہے اس لیے ریاست میں دین کی اقامت کا انحصار بھی افراد ہی پر ہوتا ہے۔ کیا اب بھی آپ کو سمجھ نہیں آئی کہ جب تک آپ فرد کو نہ بدلیں ریاست میں دین قائم نہیں ہو سکتا کیونکہ ریاست کے دینی احکام پر عمل فرد ہی نے کرنا اور کرانا ہوتا ہے۔اور فرد کو آپ کیسے بدلیں گے؟ ظاہر ہے تعلیم وتزکیہ کے ذریعے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں انبیاء کرام کو اور آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بار بار اس کا حکم دیا ہے۔ازراہِ کرم سوچیں اور غور کریں!

* قارئین میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ جب مَیں بھی قیامِ اسلامی ریاست اور حکومت کے علماء وصلحاء کے ہاتھ میں ہونے کا قائل ہوں اور جماعت اسلامی والے بھی تعلیم وتزکیہ اور دعوت واصلاح کے منکر نہیں تو جھگڑا کس بات کا ہے؟

جھگڑا کوئی نہیں فرق صرف دو باتوں کا ہے۔ایک یہ کہ ہم کہتے ہیں کہ دین میں نبیادی اہمیت تعلیم وتزکیہ کو حاصل ہے جبکہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور جماعت اسلامی کے نزدیک بنیادی اہمیت سیاسی جدوجہد سے قیامِ ریاستِ اسلامی کو ہے۔دوسرا یہ کہ ہم سمجھتے ہیں کہ تعلیم وتزکیہ سے فرد و معاشرے کی اسلامی تناظر میں اصلاح کے بغیر اور مغرب کی الحادی سیکولر لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت میں کچھ کاغذی اصول درج کر کے اسے 'اسلامی جمہوریت' قرار دینے اور اس کے تحت جدوجہد کرنے سے اسلامی ریاست قائم نہیں ہوسکتی جبکہ اہلِ جماعت کا اصرار ہے کہ ان کی نظر میں پاکستان میں نفاذِ شریعت اور اقامتِ دین کا صرف یہی طریقہ صحیح ہے۔

بہرحال قارئینِ البرہان ڈاکٹر صاحب کا انگریزی مضمون بھی پڑھ لیں اور ہماری یہ وضاحت بھی اور خود فیصلہ کرنے کی کوشش کریں کہ کس کا مؤقف شرعاً قابلِ ترجیح ہے۔ہم فاضل قارئین کے متوازن اظہارِ خیال کو خوش آمدید کہیں گے۔

پس نوشت

تعلیم وتزکیہ (بشمول رجوع الی القرآن) اور معاشرتی تنظیم (جیسے مسجد کو مرکز بنا کر غربت میں کمی، تعلیم و تربیت، امن وامان کی بحالی، خدمتِ خلق، مصالحتی عدالتوں کے قیام وغیرہ) کا کام کرنے کے تو ہم بہت پہلے سے علمبردار ہیں۔ حال ہی میں ہم نے اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے دو مزید منصوبوں کی طرف مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے اجتماعی نظاموں کی تدوینِ نو کی جائے (جیسے اسلام کا معاشی نظام، سیاسی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام کی تفصیلات کا تعین کرنا)۔ یاد رہے کہ یہ وہی کام ہے جو ہمارے اسلاف اور فقہاء ماضی میں ہمیشہ کرتے رہے ہیں لیکن آج کل ان کی اس طرف توجہ نہیں رہی۔ دوسرے حلقۂ ہائے تفہیم فکر مغرب کا قیام تا کہ امت کو مغرب کی الحادی، سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ فکر وتہذیب کے سیلاب سے بچایا جاسکے۔

ان دونوں منصوبوں اور ہمارے پہلے ذکر کردہ پروگراموں (یعنی تعلیم وتزکیہ اور معاشرتی تنظیم کے ذریعے جدوجہد) پر اگر عمل کیا جائے تو اس سے لامحالہ دین کے لیے موجودہ طرز کی سیاسی جدوجہد کرنے والوں کو بھی فائدہ ہی ہوگا اور بہت فائدہ ہوگا، ان شاء اللہ۔ اس مضمون پر مزید تفصیل کے لیے دیکھیے اسی شمارے میں ہمارا مضمون 'نفاذِ شریعت کا متبادل منہاج'۔

Dr. Javed Akbar Ansari : Book Review:بقیہ

Let us participate in this *jihad* which is underway and avoid the absurdity of abstract moral building in the vain hope that some نیک نیت ruler will emerge in Turkey or Saudi Arabia or Pakistan miraculously to concretize our arbitrary abstractions. As revolutionaries we argue that we cannot theoretically know how Islamic order will be made functional in contemporary circumstances until it is (imperfectly and piecemeal) articulated in several practices. The overcoming of capitalist global hegemony is a centuries-long journey and currently we are only in the beginning of their work.

البرہان کی ڈاک

البرہان کے نام

لیاقت بلوچ (نائب امیر جماعت اسلامی، پاکستان)

مَیں ماہنامہ البرہان کا بھی مستقل قاری ہوں۔ مضامین، تجزیہ، آراء سے آگہی رہتی ہے۔ ۴ جولائی ۲۰۲۳ء کو آپ نے کتب ارسال کیں موصول ہوگئیں، پہلے بھی یہ میرے پاس موجود ہیں وقتاً فوقتاً مختلف ابواب زیرِ مطالعہ رہتے ہیں۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اقامتِ دین، قرآن وسنت کی بالادستی اور دینی محاذ پر پیش رفت و کامیابی آپ کی آراء، جذبات اور احساسات پر غالب ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ دیگر جماعتوں کے معاملات کیا ہیں وہ اس کے براہ راست خود ذمہ دار ہیں ہم جماعت اسلامی کے حوالے سے جواب دہ ہیں۔ الحمدللہ جماعت اسلامی کے اندر تجزیہ، اپنے معاملات پر ہر پہلو سے نظر رکھنے اور دستورِ جماعت کی روشنی میں پالیسی سازی اور فیصلے کیے جاتے ہیں۔

ملکی سیاسی حالات، تنہا دینی جماعتوں کے اختیار میں نہیں۔ بیرونی و اندرونی قوتیں کار فرما ہیں۔ مفاد پرستی، دنیاداری، اقتدار کے حصول کی ہوس سیاست پر حاوی ہے۔ اسی کے گرد عامۃ الناس کا ذہن بنایا جاتا ہے اور عوامی جذبات سے کھیلا جاتا ہے۔ سیاست، انتخابات جمہوری پارلیمانی عمل پر صاحبان آراء کی مختلف آراء ہیں اور یہ حقیقت ہے۔ اگر ہم ایک دوسرے کو اپنے مؤقف سے ہٹانے پر ہی سارا زور ڈالتے رہیں تو نتیجہ دیوار پر لکھا ہے۔

یہ بھی المناک صورتِ حال ہے کہ پہلے مسلک کی بنیاد پر دینی جماعتیں اپنے وجود اور دائرے میں آواز اور طاقت رکھتی تھیں لیکن مسلکی شدت نے جہاں باہر کی تلخی پیدا کی ہے وہیں اس تلخی کی تپش سے خود مسالک کی جماعتیں بھی متاثر ہوگئی ہیں۔ بہرحال یہ امر متقاضی ہے کہ تجزیوں، تحریروں اور کمزوریوں کی تلاش اور نشاندہی سے بڑھ کر سنجیدہ کوشش کی جائے کہ درپیش بحرانوں اور زبوں حالی سے کیسے نجات پائی جائے؟

آپ کا جذبہ اچھا اور غلبہ دین کے احساسات سے لبریز ہے۔ مثبت تعمیری کوشش ہوگی تو

ضرور راستہ نکلے گا۔ اقامتِ دین، آئین وقانون کی فرمانروائی اور سماجی معاشرتی محاذ پر ہر پہلو سے اصلاح کے ہمہ گیر پروگرام کی ضرورت ہے۔ جماعتِ اسلامی کی مرکزی مجلس شوریٰ کی مجالس قائمہ، تحقیقاتی ادارے، ورکنگ گروپس اپنی حدتک کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان میں کس بہتری کی ضرورت ہے؟ اسی پر غور وفکر ہونا چاہیے۔ جماعتوں قیادت کو ہدفِ تنقید بنائے رکھنے سے اصلاح کی بجائے شیطان کی شرارتیں اپنا زور پکڑتی ہیں۔ جماعتوں، قائدین اور ذمہ داران کا احترام وعزتِ نفس ملحوظ رکھ کر ہی اصلاحی تدابیر تلاش کی جاسکتی ہیں۔

میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ دینی جذبہ واحساس کے ساتھ آپ مختلف امور پر متوجہ کرتے ہیں یقیناً پیش رفت کے لیے ہمہ گیر وہمہ پہلو مثبت رویوں اور اقدامات کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو، آمین۔

حمید سیال (سیالکوٹ)

خورشید ندیم کی تقرری کی مذمت

خورشید ندیم صاحب جاوید غامدی صاحب کے شاگرد ہیں اور اپنی سیکولر اور لبرل فکر کے لیے معروف ہیں۔ وہ نہ علوم اسلامیہ کے پروفیسر ہیں، نہ عالم دین ہیں اور نہ اسلام کے محقق۔ ایسے شخص کو جس کی اسلامی علمیت مشکوک ہو، اسے پہلے اسلامی نظریاتی کونسل کا رکن بنایا گیا اور اب انہیں رحمۃ للعالمین اتھارٹی کا چیئرمین بنادیا گیا ہے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ مسلم لیگ ن اور فوج کے حامی ہیں اور عمران خاں کی مخالفت میں کالم لکھنے کی شہرت رکھتے ہیں۔ سابق وزیر اعظم شہباز شریف کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ جاتے جاتے عوام کے ٹیکس کے پیسوں سے ایک ایسے شخص کو اعلیٰ سرکاری عہدے سے نواز دیں جس کا وہ مستحق نہ ہو۔ میں اس تقرری پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرانا چاہتا ہوں۔

ملک شفقت حیات (لاہور)

اگست کے البرہان میں شائع تینوں خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر جناب اختر حسین عزمی نے بڑی تفصیل سے جناب خالد جامعی صاحب کے خیالات کا محاکمہ

کیا ہے۔قابل احترام جامعی صاحب اکثر بڑے جذباتی انداز میں یکطرفہ رائے کا اظہار کرتے ہیں ۔انہوں نے انگریزی کتابوں کی ایک فہرست مرتب کر رکھی ہے جو ان کی دانست میں مغربی تہذیب کو سمجھنے کے لیے کافی وشافعی ہے۔شاید کوئی وقت کا فرہاد ہی ہو جو اس پہاڑ کو کھود سکے۔خود آنجناب تو آج تک نہیں بتا سکے کہ ان کتابوں کے کون سے متعلقہ صفحات پڑھنے چاہئیں اور ان میں پڑھنے اور سمجھنے کو کیا ہے۔انھوں نے بڑی خوشی کی بات بتائی ہے کہ پچاس سال بعد جناب تقی عثمانی صاحب نے تفہیم مغرب کے کورس کو اپنے ہاں پڑھانے پر آمادگی ظاہر کر دی ہے جس کے لیے جامعی صاحب نے اپنی انگریزی کی مرتبہ کتابوں کی فہرست بھی پیش کر دی ہے۔دیکھتے ہیں کیا گزرتی ہے قطرے پر گہر ہونے تک!

پہلے بھی یہ مذکورہ کورس پڑھانے والوں کی عدم دستیابی پر سرے نہ چڑھ سکا تھا،اب تو اور بھی قحط الرجال ہے۔کیا جناب خالد جامعی صاحب اکیلے ہی اس کے لیے کافی ہوں گے یا اور افراد اس غرض کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔کہیں چنیدہ افراد کے بغیر ہنڈیا چوراہے میں ہی تو نہیں پھوٹ جائے گی۔امید ہے آپ اس قابل عمل منصوبہ پر بھی قارئین کی راہنمائی فرمائیں گے۔ جزاك الله خیرًا۔

رضی الدین سید (کراچی)

آپ کی نشان دہی پر کہ مولانا مودودیؒ نے جمہوری جدوجہد کی رائے سے رجوع کر لیا تھا، میں نے وہ عبارت اصل کتاب میں بھی دیکھ لی ہے جو''اسلامی ریاست'' کے نئے ایڈیشن نومبر 2020ء میں صفحہ 499 پر موجود ہے۔آپ کی عبارت بھی وہی ہے۔اور لگتا ہے جیسے میرے لئے یہ پہلی بار سامنے أئی ہے۔آج تک کبھی اس کا تذکرہ سنا نہیں تھا۔مسئلہ یہ بھی ہے کہ اب مولانا کے بیشتر ساتھی دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔جو نئے ذمہ دار حضرات ہیں، ان کے لیے بھی شاید یہ عبارت نئی ہو اور وہ اس کی مختلف تاویلیں پیش کریں۔

ویسے رائے یہی بنتی نظر آ رہی ہے کہ انتخابات سے اس جکڑے اور سخت سیکولر نظام کے اندر کوئی مثبت نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے۔البتہ وہ جو محض دعوتی کام ہے، وہ بھی شاید نتیجہ خیز نہ ہو جیسا کہ جماعت کی سیاسی جدوجہد چھہتر سالوں بعد بھی نتیجہ خیز نہیں بن سکی ہے۔(بقیہ صفحہ نمبر ۸)

accompanied by a simultaneous growth of the social and statal power of the *Mukhliseen-e-deen*. Without the conquest of state power, Islamic education and spirituality will necessarily remain marginal retreats from secular order.

The power of the state has grown tremendously in capitalist order. The rule of capital is imposed upon society by the capitalist state and capitalist individuality is formed by subservience to capitalist governance. As Mulana Maududi has stressed the key task of the Islamic revolutionaries in the contemporary world is the deconstruction of the capitalist state.

It is the capture of statal power which enables us to foster Islamic individuation in Iran and Afghanistan. Islamic revolutionary movements throughout the world are rightly focused on the struggle to deconstruct the capitalist state either through direct overthrow (as in Iran and Afghanistan) or through a process of enhancing contradictions within capitalist systems of governance i.e. through the social and political empowerment of *Mukhliseen-e-deen*.

The struggle against capitalist world order is immediately political – a struggle to dispose capital of its governance authority. Intellectual effort must focus on this vital task. We have established two Islamic states (and Insha Allah soon there will be more in coastal Africa). Both these states are struggling to avoid absorption within the global capitalist economy and society. Islamic revolutionaries have the primary duty to develop proposals which prevent such re-absorption. Dr. Amin's suggestion for the establishment of a research academy is a welcome step. As Islamic revolutionaries we suggest that the work of this institute must focus on the real, here and now, needs and problems that Iran and Afghanistan are facing. As revolutionaries we recognize that theory follows practice – Islamic individuality and society is being fostered through the agency of the Islamic state in Iran and Afghanistan.(see page # 75)بقیہ

Islamic Revolutionary Response

We agree with the need to nurturing Islamic individuation. Indeed, we understand systemic decline as a process when Islam ceased to spread in Europe, India, China and Africa despite Muslim political dominance and we date decline from the early Abbasid period and the establishment of Umayyad rule in Spain. We regard the Dawah work among the non-Muslims of Europe, America, China, India and Africa as a key element of the contemporary Islamic revolutionary process and have deep links and close links with the Sufia during this work.

Islamic revolution is a process and not a state. We recognize individuation as a quasi-societal and statal process. Individuals exist within societies and are governed by specific state orders. It is impossible to "educate" an individual from out of a given social/statal order without institutionalization – that is why a prioritization of individuation over social/statal penetration is an idealist fantasy. Individuation and social/statal reconstruction are simultaneous aspects of the process of اقامت دین. They are not hierarchally structured with promotion of individuality leading to an automatic/spontaneous reconstruction of social/statal order.

That is why the Prophet ﷺ initiated the process of society and state building from the earlier days of Makkah. He tried to establish a Muslim community in Makkah, with its own customs and norms. Islamic legalization in embryonic form also started in Makkah. He ﷺ established a state within a state in Makkah rejecting the authority of the tribal legislative assembly (ندوہ). In Madina state institution became key instrument for the flourishing of Islamic individuality.

Without social and statal institutionalization individuality remains powerless. Growth of Islamic consciousness must be

knowledge and spirituality. He claims that the Prophet ﷺ focused entirely on the formation of Islamic individuality. The sole cause of Islamic thought and civilization's supremacy in the world during the 4th, 7th and 11th centuries were Islamic character formation at the individual level. Islamic individuation automatically and spontaneously begets Islam's social and state order. The fundamental cause of Islamic decline is erosion of Islamic individuality and the fundamental cause of this erosion according to Dr. Amin is the corruption and entropy of the education system.

Hence counteract زوال depends entirely on nurturing Islamic individuality which automatically/spontaneously/ unproblematically leads to the dominance of Islamic thought and civilization at the social and state levels. Islamic dominance does not require institution building at the social and state level. Everything depends solely on strengthening Islamic individuation and the only means for this according to Dr. Amin is strengthening Islamic educators and promoting Islamic spirituality.

According to Dr. Amin the challenge of "Western" global dominance can be met by deconstructing "Western" epistemologies and knowledge systems. Muslims must be taught to reject "Western" knowledge's and socially and politically conceptualized model building on the basis of Islamic theoretical paradigms must be undertaken. Social and political confrontation with the "West" must be postponed and regarded as "fruitless" until the universalization of Islamic individualities at least in the Muslim world. Elsewhere (Al-Burhan, July 2023, pp. 51-53) Dr. Amin proposes the establishment of a research academy to undertake the task of constructing Islamic model building in response to contemporary challenges.

Dr. Javed Akbar Ansari Book Review

Islamic Individuation and the Islamic Revolutionary Process

A response to Dr. Muhammad Amin's Treatise
امت مسلمہ کو درپیش چیلنجز اور ان کا حل

Dr. Amin is one of our leading ulema who has spent a lifetime problematizing the process of Islamic individuation, socialization and state formation in the here and now of the 21st century. The treatise under review represents a succinct summary of his extensive work. I first summarize his views on the strategy to meet contemporary challenges to Islamic thought and civilization and then present a revolutionary appreciation of his discourse. Hence this review focusses on p. 39-48 and I refrain from comments on the rest of the treatise despite my fundamental disagreement with Dr. Amin's analysis of the tendency he analyses as *Tatbeeq*(تطبیق).

Dr. Amin's Revivalist Strategy

Dr. Amin argues that Islamic thought and civilization currently face two major challenges (a) the challenge of overcoming decline and (b) the challenge posed by Western thought and order. His concept of "decline" remains ambiguous – he dates it variously sometimes from the 4th century of the Hijrah, sometimes from the 7th and sometimes from the 11th/12th centuries. Nevertheless, his conception of decline is comprehensive and systemic."Decline" is presumed to have occurred at all levels – individual, societal and state. Here (as elsewhere) the relationship between these concepts of decline are not problematized.

Dr. Amin argues that the necessary and sufficient response to this decline should be the promotion of Islamic

تزکیۂ نفس

پروفیسر ارشد جاوید[۱]

ہم اچھے مسلمان کیسے بنیں؟

صرف جھوٹ چھوڑ دینے سے ہم بے شمار گناہوں سے بچ سکتے ہیں

* آیئے! اچھے مسلمان بنیں، مثالی معاشرے کی تشکیل کریں اور دوزخ کی آگ سے بچیں

* ایک مغربی دانشور نے کہا کہ قرآن دنیا کی بہترین کتاب ہے اور مسلمان بدترین قوم (مسلمان قرآن پر عمل نہیں کرتے)۔

* کسی مسلمان کا عبادات کے بغیر جنت میں جانا مشکل ہے لیکن کوئی مسلمان اچھے معاملات کے بغیر صرف عبادات کی بنیاد پر جنت میں نہ جائے گا۔

* قرآن میں ارشاد ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ضرور ہو جو نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مومن ہر فضول کام کر سکتا ہے مگر وہ جھوٹا اور خائن/ بددیانت نہیں ہوسکتا۔ خدا نے بھی جھوٹوں پر لعنت کی ہے، جس پر خدا لعنت کرے وہ کیسے دوزخ کے عذاب سے بچ سکتا ہے؟ بدقسمتی سے پاکستان کے مسلمان ہر غلط کام تو نہیں کرتے مگر پاکستانیوں کی عظیم تعداد جھوٹی اور بددیانت ہے۔

* ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم میں سے اکثر لوگ خاص طور پر نمازی حضرات اپنے رب سے وعدہ کریں کہ وہ جھوٹ نہ بولیں گی اور نہ ہی بددیانتی کریں گے تو یقین ہے کہ پاکستان میں شاندار تبدیلی آ جائے گی۔ آپ بھی ہمارے ساتھ شامل ہوں۔ ہم سب اپنے رب سے عہد کریں کہ ہم نہ جھوٹ بولیں گے اور نہ ہی بددیانتی کریں گے۔

---

[۱] معروف ماہر نفسیات، لاہور